www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جون 2017

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا انتہائی سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 1 | شمارہ: 1 | جون 2017

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

مشیر: شعیب رضا فاطمی

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ اینڈ ڈیزائننگ: محمد فہیم

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in, ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مکالمہ — مدیر — 4

روبرو — 5

ذکیہ مشہدی سے احمد صغیر کی بات چیت

شخصیت — 9

تحریک آزادی نسواں میں نذر سجاد حیدر کا حصہ

نوشابہ سعدیہ

پرواز کے نئے آسمان — 12

سارہ حمید احمد — نصرت جہاں

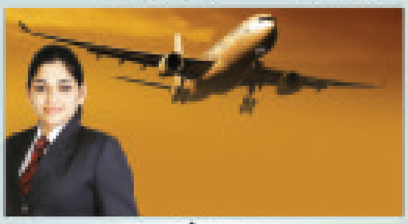

نکہت سخن — 14

شاعرات کے منتخب اشعار

جہان نسواں — 15

میڈم کیوری

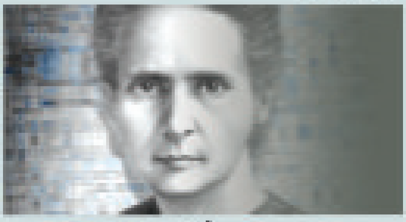

سیاہ چادر کے پار — انجم فریدی — 17

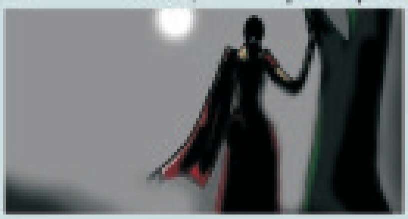

خدیجہ مستور کی فکری اساس — غزالہ فاطمہ 19

مشترکہ وراثت اور جمہوری زبان — رضوانہ 23

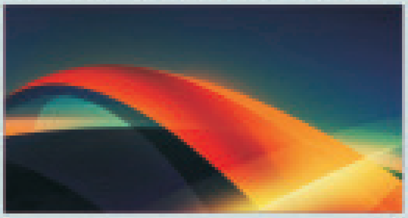

تعلیم نسواں کا نقیب — سیما صغیر 26

قانون میں خواتین — 30

تعزیرات ہند اور خواتین جنسی و دیگر جرائم

کہانیاں

اللہ کے بندے — قمر قدیر ارم — 34

ایک لفظ کی کشتی — لالی چودھری — 36

کسک — عشرت ناہید — 42

دل کی گلیاں — روبینہ ساگر — 48

حسن سخن

تسیم نیازی 51 صبیحہ سنبل 47

بلقیس ظفیر الحسن — 52

کہکشاں تبسم 53، پروین شیر، سلمیٰ صنم — 54

باورچی خانہ — 55

گرمیوں سے راحت دینے والے مشروبات و حلوے

آرائش و زیبائش

بالوں کی خوبصورتی — 57

تاثرات — 59

خواتین خبرنامہ — 61

مکالمہ

خواتین دنیا کا دوسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ایک کوشش ہے دنیائے اردو کی خواتین کو ایک ایسا اسٹیج فراہم کرانے کی جہاں سے وہ کھل کر اپنے مسائل و تجربات کی روشنی میں گفتگو کر سکیں، ایک مکالمہ قائم ہو اس پورے سماج سے جہاں عورتوں کا سب سے ممتاز مقام ہے، تھا اور رہے گا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن ہی نہیں کہ ہمارے ادبی سرمایے کا وافر حصہ خواتین کا ہے یا پھر خواتین سے منسوب ہے۔ مرد تخلیق کاروں نے جہاں بھی اپنے تخلیقی شہہ پارے کا رشتہ جذبات و احساسات سے جوڑا ہے وہیں ایک مکمل عورت کا وجود آ کھڑا ہوا ہے۔ وہ عورت جو ایک لاثانی تخلیق ہے اور جو نسل انسانی کے کارواں کو سرگرم رکھنے کا سب سے اہم وسیلہ بھی ہے اور ادب اس وجود کو منہا کر کے اپنی بنیادوں پر کھڑا ہی نہیں رہ سکتا۔

اور یہی سبب ہے کہ ہمیں نسائی ادب کی ضرورت ہے اس نسائی ادب کی جس میں پیار و محبت، اخلاص و قربانی، درد و کرب، نشاط و خود فراموشی، جذبات و سرخوشی، سرور آگیں کیف۔ وہ کیف و سرور جو نیند سے بیدار کرے اور ذہن کو تمام طرح کی بیجا پابندیوں سے آزاد کرانے میں معاون ہو سکے۔ ابھی خواتین دنیا کے سفر کا آغاز ہے، اس کے مشمولات میں تبدیلی کی گنجائش بھی ہے اور اس کے لیے مختلف موضوعات پر آپ کی تحریروں کا ہمیں انتظار رہے گا۔ رسالے میں تخلیق کے ساتھ تجزیاتی و تنقیدی مضامین کی شمولیت بھی ناگزیر ہے تاکہ اردو جامعات کی تازہ کار قلمکاروں کو مزید غور و فکر کا موقع فراہم ہو سکے۔ یہ کہنا کہ 20 ویں اور انیسویں صدی میں خواتین کے جو مسائل تھے 21 ویں صدی میں سرے سے ان مسائل کو حل کر لیا گیا ہے؟ حق گوئی نہ ہوگی لیکن یہ بھی کہنا بیجا ہوگا کہ آج کی خواتین 19 ویں اور بیسویں صدی سے آگے نہیں بڑھی ہیں۔ جہاں معاشرے میں تبدیلیوں کا طوفان آیا ہوا ہو وہاں تبدیلی تو ناگزیر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طوفان بلا خیز نے جہاں خواتین کے بہت سارے مسائل حل کیے ہیں وہیں نت نئے مسائل بھی ان کے سامنے کھڑے کر دیے ہیں اور ان چیلنجز و مسائل سے وہ پامردی کے ساتھ مقابلہ بھی کر رہی ہیں ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ پوری دنیا کو ایک گاؤں تصور کرنے کے ساتھ ساتھ اس گاؤں میں موجود تہذیبی قلعوں کی حفاظت بھی ضروری ہے جن قلعوں کے حصار میں ہی خواتین خود کو محفوظ و مامون سمجھتی ہیں۔ ان قلعوں میں نئی کھڑکیاں اور دروازوں کا قیام بھی ناگزیر ہے تاکہ وہاں سے ہر طرح کی خوشگوار ہوائیں، روشنی اور افکار بہ آسانی آ سکیں۔ خواتین کے فکری اور فنی محسوسات کو بھی عام ہونے کا موقع اسی وقت فراہم ہوگا جب ہم ان کی تخلیقات کو نمایاں طور پر شائع کر کے بین الاقوامی ادبی منظرنامے کا حصہ بنائیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد جہاں بہت سارے اہم اور بڑے پروگرام کونسل کی سرگرمیوں میں شامل ہوئے ہیں وہیں خواتین دنیا کی شکل میں ملک اور بیرون ملک سے جاری سرکاری رسالوں میں اولین رسالہ بھی، جسے عالمی معیار کا ماہنامہ قرار دینا مبالغہ نہ ہوگا، شامل ہو گیا۔ اس کے لیے میں اپنے چیئرمین و مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر جی کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس رسالے کو شائع کرنے کی اجازت دی۔ مجھے امید ہے یہ رسالہ ماہنامہ اردو دنیا، ماہنامہ بچوں کی دنیا اور سہ ماہی فکر و تحقیق کی طرح اردو عوام و خواص کے درمیان یکساں قبولیت کی سند حاصل کرے گا۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

احمد صغیر

زبان کی آبیاری ہوگی تو ادب بھی پھولے پھلے گا

ذکیہ مشہدی

احمد صغیر: اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتایئے؟

ذکیہ مشہدی: میرے ددیہالی اجداد کا تعلق مغربی یوپی کے قصبہ شیر کوٹ، ضلع بجنور سے ہے لیکن کئی کنبے اپنی اپنی وجوہات کی بنا پر لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ ننیہال کا تعلق امروہہ ضلع مراد آباد سے ہے۔ میری پیدائش میری ننیہال امروہہ میں ہوئی۔ زندگی کے ستر سال مکمل کر لیے ہیں۔ میرے والد لکھنؤ کے پروردہ اور مشہور و معروف تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے سند یافتہ حکیم تھے۔ کچھ دن لکھنؤ میں پریکٹس بھی کی لیکن پھر (شاید اس خیال کے تحت کے چھوٹی جگہ پریکٹس زیادہ آسانی سے کامیاب ہوگی، لکھنؤ کے قریب ضلع سلطانپور اودھ میں بود و باش اختیار کر لی۔

میرے والد نہایت روشن خیال، کثیر المطالعہ، بااصول اور خوش مزاج انسان تھے۔ شکار کے دھنی، بہترین نشانے باز اور حیرت انگیز حد تک سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ ساتھ ہی تعلیم نسواں کے حامی۔ ویسے میرے ددیہال کے دوسرے کنبوں میں بھی تعلیم نسواں بہت پہلے رائج ہو چکی تھی۔ میری دو بہنیں اور ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔ بہنوں کے بعد دو بھائی ہیں۔ سب مطالعہ کے شوقین۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اپنی اپنی زندگی میں بخوبی Settle ہیں۔ اُردو سے سب کو شغف ہے اور یہ والد کی دین ہے۔

اص: اپنے تعلیمی سفر کی تفصیل بیان کیجیے؟

ذکیہ مشہدی: میرے بچپن کا ابتدائی حصہ لکھنؤ میں گزرا لیکن پھر والد صاحب سلطانپور منتقل ہو گئے تھے۔ اس لیے وہاں کے اسکولوں میں ابتدائی تعلیم ہوئی۔ سلطانپور چھوٹا شہر ہے لیکن وہاں بہت ہی اچھا گورنمنٹ گرلز انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ شاید اس وقت اقدار مختلف تھیں۔ میرے خیال میں آج سے بہت بہتر۔ بس کمی یہ تھی کہ اسکول میں اردو نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے کالج مذکور سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات فرسٹ ڈویژن سے پاس کیے۔ اس وقت ان امتحانات میں فرسٹ ڈویژن لانا نہایت دشوار سمجھا جاتا تھا۔ اردو والد نے سب بچوں کو خود گھر پر پڑھائی۔ اسکول کی تعلیم کے علاوہ میں نے پرائیوٹ طور پر جامعہ اُردو علی گڑھ سے ادیب اور ادیب ماہر کے امتحانات پاس کیے۔ دونوں میں (قومی سطح پر) چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ یہ امتحان علی الترتیب نویں اور دسویں جماعت کی اسکولی تعلیم کے دوران پاس کیے گئے تھے۔ میں ان کا ذکر اس لیے خاص طور پر کر رہی ہوں کہ شاید اس سے کچھ لوگوں کو پرائیوٹ طور پر اُردو خود پڑھنے یا اپنے بچوں کو پڑھانے کی ترغیب حاصل ہو سکے۔ کوئی امتحان نہ بھی پاس کیا جائے لیکن صرف نصف گھنٹہ مادری زبان کو دے دیا جائے (ہفتہ میں پانچ دن کافی ہوں گے) تو اس کی بقا کی گارنٹی لی جا سکے گی۔

انٹرمیڈیٹ کے بعد میں بی اے کرنے کے لیے لکھنؤ واپس آ گئی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے نفسیات میں ایم اے کیا اور یونیورسٹی کے ہی اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کے ڈیموگرافک ریسرچ سینٹر (Demographic Research Centre) میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنے لگی۔ ایک سال بعد مجھے لکھنؤ میں ہی لا ریٹو کونونٹ کالج میں نفسیات کے لکچرر کے عہدے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ یہاں میں نے زندگی کے چھ بڑے مسرور و مطمئن سال گزارے۔ اسی دوران میری شادی شفیع الزماں مشہدی سے ہوگئی جو بہار سول سروس کے رکن تھے اور اس وقت دہلی میں پوسٹیڈ تھے۔ کچھ عرصہ ملازمت اور دہلی لکھنؤ کے درمیان آمد و رفت جاری رکھی لیکن پھر گاڑی یوں چلتی نہ دیکھ کر ملازمت چھوڑ دی۔ میری افسانہ نگاری میں ملازمت چھوڑ کر گھریلو زندگی کو ترجیح دینے کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر میں ملازمت کرتی رہتی تو اس سے ملنے والی طمانیت شاید افسانہ نگاری کی طرف اتنا مائل نہ کرتی۔ اس لیے کہ عورت کچھ کر لے بنیادی طور پر ہاؤس وائف ہی رہتی ہے۔

اص: آپ اپنی ادبی زندگی کے بارے میں بتائیں؟

ذکیہ مشہدی: میری ادبی زندگی بڑی بے ترتیب رہی ہے۔ باضابطہ لکھنا خاصی دیر سے شروع کیا۔ گرچہ لکھنے کے جراثیم سرشت میں موجود تھے۔ سلطانپور میں کالج میگزین کے لیے زندگی کا پہلا افسانہ لکھا۔ یہ ہندی میں تھا۔ یوپی میں سرکاری اسکولوں میں اُردو نہیں تھی۔ خیر تو میری ہندی ٹیچر مس کملا دھون نے مجھے غور سے دیکھا اور بولیں ''یہ کہانی اگر واقعی تم نے لکھی ہے تو بہت آگے جاؤ گی۔ لکھتی رہنا۔'' لیکن ہمت افزائی کے باوجود مجھے توفیق نہیں ہوئی کہ ان کی رائے پر عمل کر کے لکھنا جاری رکھوں۔ 1961 سے 1975 کے طویل درمیانی وقفے میں بس ایک دو افسانے اور ایک مزاحیہ ڈرامہ 'ماڈرن انارکلی' لکھا جو لا ریڈیو کے شعبۂ ہندی میں بڑی کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا لیکن 1975 کے آس پاس میں نے افسانہ نگاری شروع کی تو پھر لکھتی رہی۔ اس سے قبل نفسیات کی دو انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر چکی تھی۔ یہ ترجمے بیورو فار پروموشن آف اردو اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے لیے لکھے گئے تھے۔ 1975 سے 2014 تک ایک طویل عرصہ ہے۔ اس مدت کو دیکھا جائے تو زیادہ کچھ نہیں کر سکی ہوں۔ پانچ مجموعے آئے کہانیوں کے اور کوئی ایک درجن کتابیں ساہتیہ اکادمی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے لیے اردو/ انگریزی/ ہندی میں ترجمہ کر چکی ہوں۔ میں نے نوخواندہ بالغوں کے لیے چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی ہیں۔ جن کی تعداد دو درجن کے لگ بھگ ہیں۔ ان میں بس تین چار اردو میں ہیں۔ باقی ہندی میں۔ انھیں تعلیم بالغاں کے رسورس سینٹر، پٹنہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی اور ڈائرکٹوریٹ آف اڈلٹ ایجوکیشن، دہلی کے لیے لکھا گیا ہے۔

اص: آپ کی زبان بے حد شستہ ہے۔ جس کی وجہ سے آپ مشہور ہوئیں۔ یہ زبان آپ نے کہاں سے سیکھی؟

ذکیہ مشہدی: اُردو میری مادری زبان ہے۔ مادری زبان سب سے پہلے گھر اور گردوپیش کے ماحول سے سیکھی جاتی ہے (بشرطیکہ آپ اسی علاقے میں رہ رہے ہوں جو آپ کی مادری زبان کا علاقہ ہے) میرا تعلق لکھنؤ سے ہے اور جس وقت میں گردوپیش کے اثرات قبول کر رہی تھی، لکھنؤ نہایت شستہ اردو بولا کرتا تھا۔ اردو اپنی بہترین صورت میں ہندوؤں کے یہاں بھی رائج تھی۔ زبان کا مذہب سے کوئی تعلق اس وقت تک لکھنؤ میں نہیں تھا۔ اہل سیاست کا جو جی چاہا کرتے رہے۔ میرے والد کے ایک کائستھ دوست پیارے لال شری واستو تھے۔ میں بہت چھوٹی تھی ایک دن کہنے لگے دیکھوں بیٹا تمھارے والد محترم نے تمھیں کتنی اُردو سکھائی ہے۔ ذرا سلیٹ پر 'تحت الثریٰ' لکھ کر دکھاؤ تو میں نے صحیح لکھا تو ایک روپیہ نکال کر انعام میں دیا۔ والد کے ایک اور دوست کنور شوراج بہادر، سلطانپور میں ایس ڈی ایم تھے۔ وہاں سے تبادلہ ہو جانے کے بعد اکثر والد کو خط لکھتے تھے۔ ان کے دو خط میرے پاس محفوظ ہیں۔ القاب میں لکھتے تھے۔ کرم فرمائے من قبلہ جناب حکیم صاحب، اس ماحول میں زبان خود بخود مزاج کا حصہ بنتی جاتی ہے۔ اب وہ اردو ہو یا کسی اور لسانی علاقے کی کوئی اور زبان۔

اص: خواتین اُردو افسانے کی طرف نہیں آ رہی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ذکیہ مشہدی: ارے بھائی اردو زبان و ادب کی طرف رجحان بالعموم کم ہوا ہے۔ اس لیے لکھنے والے بھی کم ہوئے ہیں۔ خواتین ہیں تو سہی۔ عذرا نقوی، غزال ضیغم، ترنم ریاض، نگار عظیم، نجمہ محمود، شائستہ فاخری۔ اب جو بالکل نئی نسل ہے وہ اردو سے بیگانہ ہے پھر بھی بالکل مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان میں تو خواتین بڑے جھنڈے گاڑ رہی ہیں۔

اص: بہار میں اُردو خواتین افسانہ نگاروں کا فقدان ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ذکیہ مشہدی: بہار میں خواتین فکشن نگاروں کی شدید کمی کی طرف میرا دھیان بھی گیا ہے لیکن مجھے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں مل پایا۔ میں جو محسوس کرتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ بہار میں خواتین کی تعلیم دیر سے آئی۔ اس کے علاوہ بہار شاید آج بھی خاصا قدامت پرست ہے۔ خواتین کا لکھنا کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ رشیدۃ النسا بیگم عرف رشیدن بی بی اور جمیلہ خدا بخش (جن کے آٹھ دیوان موجود ہیں) پھر ان کے بعد شکیلہ اختر کو شاید خوش قسمتی سے ایسے شوہر اور دوسرے اہل خانہ ملے جنھوں نے لکھنے پر اعتراض نہیں کیا۔ اب جو نئی نسل آئی اس نے تعلیم تو ضرور حاصل کی لیکن پروفیشنل کورسیس کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ اس لیے ادب کی طرف توجہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں فکشن نگاروں کی تعداد میں نمایاں کمی (یا فقدان) یہاں کے مردوں کے رویے (Attitude) اور کچھ عمومی حالات کی وجہ سے ہے۔

اص: آپ ناول کی طرف کیوں راغب نہیں ہوئیں؟

ذکیہ مشہدی: میرے مزاج کی افتاد کچھ ایسی ہے کہ ناول کے لیے جس یکسوئی اور صبر کی ضرورت ہے وہ میرے پاس نہیں ہے پھر کچھ حالات ایسے رہے کہ لکھنے کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکی۔ افسانہ جلدی

مکمل ہو جاتا ہے۔ ناتمام رہ جاتا ہے تو دوبارہ اس کا سرا پکڑنے میں وقت نہیں ہوتی۔ کئی افسانے تو نامکمل رہ جانے کے مہینوں بعد اٹھائے اور مکمل کر لیے۔ ناول کے ساتھ ایسا کرنا مشکل ہے۔ حال ہی میں میرا ممکنہ ناولٹ 'پارسائی بی کا بگھار' اسی کا شکار ہوا (یہ ایک طویل مختصر افسانہ کی صورت میں کراچی کے مقتدر جریدے 'آج' میں شائع ہوا ہے)۔ ادھر میں نے ایک ناول کو ہاتھ لگایا ہے۔ شاید پورا کر سکوں۔ فی الحال تو اُمید ہی اُمید ہے۔

اص: آپ کو جو شہرت ملی ہے اس سے مطمئن ہیں؟

ذکیہ مشہدی: دولت کی طرح شہرت کی بھی ہوس ہوا کرتی ہے۔ اگر ہوس پیدا ہو گئی تو کبھی اطمینان نہیں ہوتا۔ میرے اندر یہ صفت نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ شہرت حاصل کرنے کے لیے میں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ ادبی محفلوں میں شاذ و نادر ہی جاتی ہوں۔ میں خاموشی سے گوشہ نشیں رہ کر جب فرصت کے لمحات میسر ہوتے ہیں کوئی افسانہ لکھ لیتی ہوں۔ قارئین سے کبھی کبھی پسندیدگی کی اطلاع مل جاتی ہے۔ میں اس میں خوش ہوں۔ ابھی ساہتیہ اکادمی دہلی کے لیے ایک بنگلہ ناول کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ (ترجمے کے لیے انگریزی ترجمے کو استعمال کیا تھا، مجھے بنگلہ نہیں آتی)۔ تقریباً آٹھ دس مہینے کام کیا۔ اس سے مجھے کچھ شہرت نہیں ملنے والی۔ جو ذہنی طمانیت ملی وہ میرا انعام ہے۔ میں اس میں خوش ہوں پھر اردو پڑھنے والے ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ کہاں کی شہرت اور کیسی شہرت۔

اص: کہا جا رہا ہے ابھی فکشن کا دور ہے۔ اس رائے سے آپ کہاں تک اتفاق کرتی ہیں؟

ذکیہ مشہدی: میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ فکشن، شاعری، سوانح، سفرنامے لگ بھگ سبھی اصناف شانہ بہ شانہ چلتی رہتی ہیں۔ ادھر کئی خود نوشت سوانح بھی نظر سے گزریں۔ مثلاً عابد سہیل، وارث کرمانی، رتن سنگھ۔ تینوں بہت دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ویسے عام قاری افسانے زیادہ پسند کرتا ہے۔ شاعری پڑھنے کی چیز کم اور سننے کی چیز زیادہ ہے۔ شاید آپ ایسا اس لیے کہہ رہے ہوں کہ ان پرانے شاعروں کے بعد جو چوٹی پر تشریف فرما تھے نئے لوگوں میں اتنا بڑا نام ابھر کر سامنے نہیں آیا تو یہ بتائیے کہ فکشن میں جو قد آور ہستیاں تھیں۔ ان کی جگہ کہاں پُر ہوتی نظر آ رہی ہے؟ جو لوگ ہمارے سامنے ہیں انھیں میں سے کچھ بہت آگے جائیں گے اور یقیناً وہ مرتبہ حاصل کریں گے کہ ہم ان پر فخر کر سکیں۔ شاعری ہو یا افسانہ نگاری اور ہم اردو کی جب بھی بات کریں۔ ہمیں اپنے ہمسایہ ملک کو نہیں بھولنا چاہیے۔ اس لیے کہ اردو پورے برصغیر کی زبان رہی ہے۔ دیوار کھڑی کر کے علاقہ تقسیم ہو جانے سے زبان و ادب کے فروغ کو ہم الگ نہیں کر سکتے۔

اص: کیا یہ سچ ہے کہ فکشن بہار میں ہی لکھا جا رہا ہے؟

ذکیہ مشہدی: اس وقت اردو بہار میں یو۔پی۔ اور دہلی کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہے۔ یہاں اردو کے رسالوں کی کھپت بہت زیادہ ہے۔ گھروں میں بھی اردو کی کتابیں نظر آتی ہیں۔ اُردو میڈیم اسکول موجود ہیں۔ اس لیے لکھنے والے بھی تعداد میں زیادہ ہیں۔ ادبی رسائل میں کوئی رسالہ شاید ہی ہوگا جس میں بہار کے افسانہ نگار دکھائی نہ پڑیں لیکن یہ کہنا ذرا زیادتی ہوگی کہ فکشن صرف بہار میں لکھا جا رہا ہے۔ خواتین کے حوالے سے تو آپ نے فقدان کا استعمال کیا تو بہار سے باہر خواتین لکھ رہی ہیں اور اچھا لکھ رہی ہیں۔ انھیں آپ بالکل ہی نظر انداز کر دیں گے؟ کلکتہ کے صدیق عالم اور دہلی کے خالد جاوید کی بڑی پذیرائی ہو رہی ہے۔ سید محمد اشرف گرچہ ادھر خاموش ہیں لیکن پوری اُمید ہے کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد یقیناً ان کی بھرپور واپسی ہوگی۔

اص: کیا موجودہ اُردو تنقید سے آپ مطمئن ہیں؟

ذکیہ مشہدی: اُردو تنقید میں بڑے معتبر نام موجود ہیں گرچہ کچھ نہایت جید ہستیوں نے حال ہی میں ہمارا ساتھ چھوڑا ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ ایک نئی نسل ابھر کر سامنے آ رہی ہے جس سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ جیسے حقانی القاسمی، شافع قدوائی، ندیم احمد، مرزا شفیق حسین بس ایک شکایت رہ جاتی ہے کہ بعض اوقات ہمارے بڑے نام بھی تعلقات اور دوستی کو تنقید میں راہ دیتے ہیں۔

بعض جینوین فنکار معروضی تنقید سے محروم رہ جاتے ہیں۔ انھیں وہ درجہ نہیں مل پاتا جس کے وہ مستحق ہیں۔ خواتین اکثر صنفی عصبیت کا شکار بنتی ہیں۔ چند سال پہلے خدا بخش اورینٹل لائبریری نے ایک سیمینار میں مجھے شکیلہ اختر پر پیپر پڑھنے کا موقع دیا تھا۔ میں نے ان کی سبھی تصنیفات لائبریری سے نکلوا لیں۔ شاید دو ناول تھے اور دو تین افسانوں کے مجموعے۔ میں نے سب کو بڑی توجہ سے پڑھا۔ ان میں تقریباً پندرہ تخلیقات ایسی تھیں جو اوسط درجے کے اعلیٰ افسانوں میں شمار ہو سکتی ہیں۔ خواہ شاہکار نہ قرار دی جائیں۔ (یہ میرا ذاتی خیال ہے) اگر ایک مکمل مجموعہ ان افسانوں کے انتخاب کا تیار کر لیا جائے تو اردو ادب میں اضافہ ہوگا۔ افسانوں کی بھیڑ بھاڑ میں ان کی عمدہ تخلیقات گم ہو گئی ہیں اور نقادوں کو قطعی فرصت نہیں کہ اس طرف توجہ دیں۔ اس سیمینار میں جناب گوپی چند نارنگ موجود تھے، وہاب اشرفی تھے، اعجاز علی ارشد صاحب

موجود تھے۔ میں نے ان سب سے بحیثیت قاری درخواست کی تھی کہ ان ہیروں کی دھول جھاڑیں۔ بہ حیثیت مجموعی اردو ادب میں اچھے ناقد ان فن موجود ہیں اور مستقبل سے بھی مایوس نہیں ہوں۔

ا ص: اُردو افسانے کا مستقبل کیسا ہے؟

ذکیہ مشہدی: میرے خیال میں تو خوش آئند ہے۔ ابھی بہت اچھے لکھنے والے بہت کم نظر آ رہے ہیں لیکن میرا یقین ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب اردو آبادی اپنے تشخص کی بقا کے لیے اپنی زبان، اپنے ادب کی طرف دوبارہ متوجہ ہوگی۔ زبان کی آبیاری ہوگی تو ادب بھی پھولے پھلے گا۔ مرکز ہوسکتا ہے تبدیل ہوجائیں۔ کرناٹک' مہاراشٹرا اور آندھرا کے کچھ علاقوں میں اردو سر اٹھاتی نظر آ رہی ہے۔

اص: ادب میں تحریکوں اور رجحانات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے اور آپ خود کو کس تحریک یا رجحان سے منسلک کرتی ہیں؟

ذکیہ مشہدی: جس وقت ترقی پسند تحریک کا بول بالا تھا اس وقت میں محض قاری تھی اور بے حد مسرور و مطمئن قاری کہ ہماری زبان میں اتنے بلند پایہ افسانہ نگار موجود ہیں۔ ایسے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ اب نام گنوانا تو تضیع اوقات ہے۔ اس تحریک کے ساتھ ہوا یہ کہ لوگوں نے اسے اوڑھنا بچھونا بنا کر ایک خاص طبقے اور خاص ازم کے دائرے میں خود کو محدود کر لیا۔ ویسے بھی کوئی چیز ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ معاشرہ تبدیل ہوتا ہے، لوگوں کے خیالات وعقائد تبدیل ہوتے ہیں۔ یوں ترقی پسند تحریک بھی ختم ہوئی لیکن اس کے بعد آنے والی جدیدیت مجھے کبھی نہیں بھائی بلکہ میں کانوں کو ہاتھ لگا کر اس سے دور بھاگتی رہی۔ میں کیا بیشتر قاری بھاگ نکلے۔ ادیبوں نے جو لکھا اسے خود ہی پڑھا۔ کوئی تیس سال پہلے میں نے دو ناول پڑھے تھے۔ 'ہزار چوراسی کی ماں' (مہاشویتا دیوی) اور 'کتھا ایک پراتر کی' (ملیالم مصنف ایس۔ کے۔ پوٹے کاٹ)۔ دونوں نے جھنجھوڑا ہی نہیں اس قدر متاثر کیا کہ پوٹے کاٹ کا ناول میں خرید لائی اور اسے کبھی کبھی اٹھا کر کہیں سے بھی پڑھ لیتی ہوں۔ دورِ جدیدیت کے اردو افسانہ نگاروں میں سے کسی کی بھی تخلیقات میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ خود کو بار بار پڑھوائیں۔ اروندھتی رائے کا 'گاڈ آف اسمال تھنگز' (God Of Small Things) بھی ان ناولوں میں ہے جو میرے سرہانے بک شیلف میں رکھے ہوئے ہیں اور خود کو پڑھواتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی ہاتھ گھما کر ناک پکڑی ہے۔ پہیلیاں بجھائی ہیں۔ پوٹے کاٹ کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان ان کا بہت بڑا وصف ہے۔ ترجمے میں زبان تو چلی گئی پھر بھی اس کی روح اس قدر طاقتور ہے کہ قاری کو باندھ لیتی ہے اور پھر اسلوب بھی۔

جدیدیت تو جلد ہی مسترد کر دی گئی۔ کم از کم اردو والوں کے یہاں۔ ہندی نے تو شاید اسے زیادہ اہمیت دی ہی نہیں تھی۔ اب رہی مابعد جدیدیت۔ میں نہیں جانتی یہ کیا ہے۔ جو کچھ جدیدیت کے بعد آئے گا اسے مابعد جدیدیت تو کہیں گے ہی۔ اردو فکشن پھر کہانی پن اور ماجرا کی طرف لوٹا۔ میں ہمیشہ سے اسی طرح کہانی کہتی چلی آ رہی ہوں۔ جیسے میری دادی زبانی سنایا کرتی تھیں۔ زمان ومکان، زبان و بیان، کردار و مکالموں کے فرق کے ساتھ —— کہ یہ تو ہمیشہ تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ اب آپ کو میری سنائی (لکھی) ہوئی کہانیاں پسند آئیں تو سنیے (یعنی پڑھیے) نہ پسند آئیں تو مسترد کر دیجیے۔

میں کسی ازم سے باضابطہ طور پر تو وابستہ نہیں ہوں لیکن سماجی نابرابری، معاشی خلیج، ذات وفرقہ پرستی پر مبنی اصلیت مجھے سخت تکلیف پہنچاتی ہیں۔ کبھی کبھی میرے اوپر گردوپیش کے واقعات سے بڑا اضمحلال (ڈپریشن) طاری ہوتا ہے۔ کبھی غصے کی وہ کیفیت ہوتی ہے جسے بے بس غصہ کہہ سکتے ہیں۔ آج کیا ادیب سماج کو بدلنے کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ شاید نہیں۔ تاوقتیکہ مہاشویتا دیوی اور اروندھتی رائے کی طرح میدان عمل میں کود پڑے۔ بہرحال لکھنا تو جاری رہے یہ امید بھی رہے کہ شاید کچھ اذہان، کہیں بھی متاثر ہوسکیں۔ کچھ نہیں تو ایک صحت مند جمالیاتی حس تو جاگے۔

ا ص: آپ کے بعد جو خواتین افسانہ نگار سامنے آئیں ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ذکیہ مشہدی: میرے بعد کئی ایسی افسانہ نگار خواتین سامنے آئی ہیں جو اردو فکشن کو باثروت بنا رہی ہیں۔ انھوں نے ناول بھی لکھے ہیں۔ خاص طور پر ترنم ریاض کا نام لینا چاہوں گی۔ انھوں نے خواتین کو اس الزام سے بری کیا ہے جو اکثر ان پر یہ کہہ کر لگایا جاتا ہے کہ وہ محض گھر آنگن کی کہانیاں لکھتی ہیں۔ نگار عظیم ہیں، عذرا نقوی صاحبہ ہیں، غزال ضیغم، شائستہ فاخری، صادقہ نواب سحر، ثروت خان، تبسم فاطمہ ہیں۔ صادقہ نواب سحر نے اردو میں مہاراشٹرا کی علاقائی زبان، ماحول، مقامی مسائل کے رنگوں کی آمیزش کی ہے۔ یہ چیز اردو کے لیے نئی اور خوش آئند ہے۔ یہ ساری خواتین اس حصار سے باہر نکل آئی ہیں۔ جو خواتین کو صرف ان کے ذاتی مسائل تک محدود رکھتا ہے۔ میں سب نام نہیں لے پا رہی ہوں۔ کچھ جواب ویسے ہی خاصے طویل ہوگئے ہیں۔ بہرحال یہ خواتین اردو افسانے/فکشن کے اچھے مستقبل کی ضامن ہیں۔

■

شخصیت

ڈاکٹر نوشابہ سعدیہ (علیگ)

تحریک آزادی نسواں میں نذر سجاد حیدر کا حصہ

انیسویں صدی کے آخر میں سر سید نے مسلمانوں میں جدید تعلیم لانے کے لیے جو تحریک چلائی اس سے کافی لوگوں کے ذہنوں میں تغیر آ گیا تھا! اور معاشرے کی بھلائی کے لیے لوگ باشعور ہونے لگے سر سید احمد اگرچہ مردوں کے حامی تھے لیکن ابتدا میں انھوں نے مردوں کی تعلیم ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اس زمانے کے مسلمان انگریزی تعلیم کو حاصل کرنا برا سمجھتے تھے۔ انگریزی کلچر کو اپنانے سے گریز کرتے بلکہ جو لوگ اس کے پابند ہوتے لوگ انھیں بری نظر سے دیکھتے اور کافرستان کے لقب سے یاد کرتے۔

سر سید احمد چاہتے تھے مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کر کے دوسری قوموں کا مقابلہ کر سکیں۔ اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے لوگوں نے تعلیم پر دھیان دیا اور یہ چاہا کہ ہماری عورتیں بھی تعلیم حاصل کریں۔ اس کے لیے وہ اچھے اور مفید مضامین لکھیں۔ اس وقت مشہور افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم نے کافی اچھے اور پر جوش مضامین لکھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم عورتوں کی جہالت دور ہو اور پرانی رسم و رواج کو ترک کر کے وہ بھی جدید تعلیم سے آراستہ ہوں اور ان کی نسل ایک تعلیم یافتہ نسل ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے اس وقت کی مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار نذر سجاد حیدر سے شادی کی، تو اس کا خاطر خواہ فائدہ ہوا اس سے تعلیم نسواں کی تحریک کو بھی تقویت ملی۔ کچھ لوگ اس تحریک کے مخالف بھی تھے، لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی تھی۔ جنھوں نے زبان و قلم کے ذریعہ تعلیم نسواں پر زور دیا اور انگریزی تعلیم کی طرف عورتوں کو متوجہ کیا۔ اس کے بعد حکومت برطانیہ نے بھی بہت کچھ سہولتیں فراہم کیں۔

نسوانی تعلیمی تحریک کے سب سے بڑے مددگار اور مرد مجاہد شیخ عبد اللہ تھے۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم کے لیے بہت بڑے بڑے کام کیے۔ انھوں نے ''خاتون'' نام کا ایک رسالہ بھی عورتوں کے لیے جاری کرایا اور اسی رسالے میں لیڈیز کانفرنس کے لیے اعلان بھی کیا۔ دوسری طرف انھیں بیگم بھوپال کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی تھی۔ جو خود بھی ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور چاہتی تھیں کہ عورتوں میں تعلیم کا شعور اور شوق پیدا ہو۔

آخر شیخ عبد اللہ، نذر سجاد حیدر اور دوسرے لوگوں نے مل کر ایک آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد کی۔ اس کے بارے میں قرۃ العین حیدر ''کار جہاں دراز ہے'' میں لکھتی ہیں۔

''علی گڑھ 24 مارچ 1914، لاہور، دہلی، مراد آباد، آگرہ، بمبئی، کلکتہ، میرٹھ سے بیبیاں جوق در جوق چلی آ رہی ہیں۔ مسلمان عورتوں کا اتنی بڑی تعداد میں ایک جگہ جمع ہونا ایک یادگار واقعہ ہے۔ بیگم عبد اللہ خود مہمانوں کے استقبال کے لیے اسٹیشن جاتی ہیں۔''

(کار جہاں دراز ہے، قرۃ العین حیدر، صفحہ 206)

اس کانفرنس کے لیے 28 مارچ 1914ء کو بھوپال کی سرکار عالیہ آئیں جن کے ہاتھوں آل انڈیا لیڈیز کے دفتر سلطان جہاں منزل کا افتتاح ہوا۔ اس کانفرنس کو کرنے والوں میں شیخ عبد اللہ بیگم نذر سجاد حیدر، بیگم آفتاب احمد، بیگم حبیب الرحمٰن، مولانا آزاد کی بہن فاطمہ، آرزو بیگم وغیرہ تھیں اور سر سید احمد خان کی بہو۔

قرۃ العین حیدر اس کانفرنس کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''29 مارچ 1914ء، ہماری اس کامیابی سے مخالفین کے جگر شق ہوئیں۔ کیا روح پرور مسرت افزا وقت تھا جب علیا حضرت کی صدارت میں ہماری آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کا پہلا اجلاس ہو رہا تھا۔ بیگم حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سکریٹری تجویز ہوئیں۔ عبد اللہ بیگم اسسٹنٹ سکریٹری میری عزیز دوست راحیلہ خاتون شروانیہ نے تھوڑی سی دیر میں بہت سی بیویوں کو کانفرنس کا ممبر بنالیا۔''

(کار جہاں دراز ہے۔ قرۃ العین حیدر۔ اول، صفحہ 207)

اس کانفرنس کی صدارت سلطان جہاں بیگم نے کی انھوں نے تحریک نسواں کے لیے بہت کچھ کیا۔ ان کا احسان ہے اور ان کا نام ہمیشہ ہندوستان میں زندہ رہے گا وہ خود بھی بہت روشن خیال تھیں۔ انھوں نے حمیدیہ کتب خانہ قائم کیا۔ جس میں ہر زبانوں کی کتابیں ہیں۔ کئی اسکول کھولے ان کی ایک تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنی قابل اور تعلیم یافتہ عورت تھیں۔

انھوں نے عورتوں کی تعلیم کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔

ایک جگہ سلطان بیگم نے اپنی تقریر میں کہا:

''اس وقت تم بالکل ظلمات میں گھری ہوئی ہو اے خاتونوں کوشش کرو اور اپنے آپ کو اس سے نکالو کیونکہ ظلمات سے نکلنے کے بعد ہی آب حیات ملتا ہے۔ اب وہ زمانہ تمھارے لیے بھی آ گیا ہے کہ آب حیواں جس سے مراد چشمہ علم ہے۔ اپنی کششوں سے حاصل کر لو۔ اور مثل سکندر ذوالقرنین کے اس چشمہ حیات کے کنارے پہنچ جاؤ مگر یاد رکھو کہ' آب حیواں' دیکھا نہیں گیا ہے۔

(خطبات سلطانیہ، ص:83)

ان خواتین میں سب سے نمایاں نام ان لوگوں کا آتا ہے۔ جنھوں نے نسواں کے لیے بہت کچھ کیا۔ ان میں نفیس دلہن، صغرا ہمایوں مرزا، نذر سجاد حیدر یلدرم وغیرہ وغیرہ نفیس دلہن تعلیم نسواں کے بڑی حامیوں میں سے تھیں۔ انھوں نے کتابیں بھی شائع کیں، جن میں ان کے شوہر حبیب الرحمٰن شروانی کے بھی مضامین تھے۔ صغرا ہمایوں مرزا بہت مشہور مصنفہ ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین اور افسانوں میں مشرق اور مغربی تہذیب کے امتزاج اور تصادم کو پیش کیا ہے اور معاشرے کی سچی تصویر دکھائی ہے۔

''بیسویں صدی کے آغاز میں جن ناول نگاروں نے مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی تحریک کی جڑوں کو مضبوط کیا ان میں صغرا ہمایوں مرزا کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ محترمہ صغرا ہمایوں نہ صرف تعلیم یافتہ تھیں بلکہ تعلیم نسواں کی زبردست حامی تھیں۔ بلکہ انھوں نے ''آزادی نسواں'' کی بھی حمایت کی، انھوں نے ہندوستانی مستورات کی زبوں حالی جہالت اور پس ماندگی کا بخوبی مطالعہ کیا اور ان کی حمایت زار کو بہتر بنانے نئی تعلیم سے آراستہ کرنے اور ذہنی غلامی سے نجات دلانے کی ایک تحریک شروع کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شاد عظیم آبادی نے بھی اپنے بعض مکتوبات میں انھیں ''سرتاج ہند'' کہہ کر مخاطب کیا ہے''۔

(بحوالہ ڈاکٹر وہاب اشرفی ''شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری'' ص:315)

تعلیم نسواں کو آگے بڑھانے میں علامہ راشد الخیری کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا اور انھوں نے اس میں بڑی خدمات انجام دیں۔ جن کو دیکھ کر لوگ انھیں ''عورتوں کا سرسید'' کہنے لگے۔ نذر سجاد حیدر علامہ راشد الخیری کو بھائی کہہ کر مخاطب کرتیں۔ یہاں تک کہ محسن نسواں بھائی کہا کرتیں۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں۔

''ان ناولوں، افسانوں اور مضامین کو پڑھ کر اور ہزاروں عورتوں، مردوں کی طرح میں بھی بہت روتی انھوں نے اردو زبان کی اتنی خدمت کی کہ جب تک اردو زندہ ہے ان کا نام زندہ ہے انھوں نے قوم کی جو خدمت کی بلکہ یوں کہنا چاہیے قوم پر جو احسانات کیے ان کا ذکر کرتے ہوئے نقاد اور مبصر شاعر اور ادیب یہ بھول جاتے ہیں کہ مولانا مرحوم پہلے شخص تھے جنھوں نے حقوق نسواں کی حمایت میں ایک بلند پایہ مردانہ رسالہ ''تمدن'' بھی شاید 1911 میں جاری کیا تھا۔ اس رسالہ کے ذریعہ بھائی مرحوم ہر مہینہ مظلوم عورتوں کے حقوق پر دردانگیز مضامین لکھ کر غفلت شعار مردوں کو جھنجوڑتے رہتے تھے ''عصمت'' عورتوں کے لیے تھا اور ''تمدن'' مردوں کے لیے۔ اور ان دونوں پرچوں کے ذریعہ قوم میں بیداری کی روح پھونک رہے تھے۔''

(محسن نسواں۔ نذر سجاد حیدر، عصمت، فروری 1950، ص:59)

نذر سجاد حیدر نے عورتوں کے حقوق اور ان کی آزادی کے لیے بڑی جدوجہد کی جب وہ بہت چھوٹی تھیں اسی وقت سے وہ ادب کے ذریعہ مسلم معاشرے کو تہذیب و تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے ناول افسانے اور مضامین لکھا کرتیں۔ اس وقت کی خواتین ادیبوں میں ان کا نام سب سے پہلے آتا ہے کیونکہ انھوں نے اس وقت سے تعلیم نسواں پر زور دیا اور اس تحریک کی ایک سرگرم رکن رہیں۔ تعلیم کے علاوہ پردہ اور زیورات کو اتار دیا۔ اور یہ سب فیشن اعلیٰ طبقے میں رائج ہو گئے۔

پروفیسر ثریا حسین لکھتی ہیں:

''بنت نذر الباقر جو اس وقت شمالی ہند کی مسلمان لڑکیوں میں منفرد حیثیت رکھتی تھیں۔ 1904 سے وہ اردو کے مشہور اور اہم رسالوں اور اخباروں میں آزادی نسواں اور تعلیم نسواں کے متعلق مضامین اور افسانے لکھ رہی تھیں۔''

(سجاد حیدر یلدرم، پروفیسر ثریا حسین، علی گڑھ، ص:57)

ایک جگہ اور ان کے بارے میں پروفیسر ثریا حسین لکھتی ہیں:

''پردے کے موضوع پر قدامت پسند حضرات کے مضامین کے جواب میں وہ نہایت جوشیلے مضامین لکھتی رہتی ان کی یہ تحریریں اس صدی کی پہلی چار دہائیوں کے اردو رسالوں اور اخباروں کے فائلوں میں محفوظ ہیں اور ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورتوں کی آزادی جس سے آج ہم اپنے پیدائشی حق کے طور پر بہرہ ور ہیں۔ اس کے حصول کے لیے ہمارے اپنے بزرگوں نے نذر سجاد حیدر اور ان کے نسل کی دوسری خواتین نے کتنی جدوجہد کی تھی۔ امریکہ کے چند سماجی مورخ ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی "Earyfeminsit" کی حیثیت سے نذر سجاد حیدر سے واقف ہو چکے ہیں۔ گو برصغیر میں ان کی

خدمات کو کب کا فراموش کر دیا گیا ہے۔''

(قومی زبان، کراچی، ص:13)

سجاد حیدر یلدرم خود بھی ذاتی طور پر روشن خیال تھے اور جب ایک تعلیم یافتہ اور تحریک نسواں کے علمبردار خاتون سے شادی ہوئی تو اس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ دونوں میاں بیوں نے مبلغ کے طور پر مل کر کام کیا۔ اس سے قدامت پرست خاندانوں کی لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کرنے میں دلچسپی لینے لگیں۔

نذر سجاد حیدر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''یلدرم کو تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کا سودا تھا۔ قسطنطنیہ میں قابل خواتین موجود تھیں۔ اور لڑکیاں پڑھائی جا رہی تھیں۔ یہی وجہ تھا کہ وہ ترکی پر مرتے تھے۔''

لڑکیوں کی تعلیم کے لیے انھوں نے کئی بڑے کام بھی کیے۔ اسکول اور ادارے بھی کھولے بچوں کی کہانیوں کے ساتھ ساتھ انگریزی میں ترجمے بھی کیے۔ جو انگریزی اخباروں میں چھپے اور اس پے انعام بھی ملے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

1912ء میں نذر الباقر کی شادی مشہور ترقی پسند ادیب سجاد حیدر یلدرم سے ہوئی پھر وہ مسوری چلی گئیں اور دہرہ دون میں لڑکیوں کا انگریزی اسکول قائم کیا اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ مسلم گرلز اسکول علی گڑھ اور کرامت حسین گرلز اسکول (یہ دونوں ادارے اس وقت مشہور ڈگری کالج ہیں۔) کے قیام کے سلسلے میں بہت کام کیا۔''

(گِلِنڈ نڈی۔ قرۃ العین حیدر۔ ص:37)

تعلیم نسواں کی تحریک کے ساتھ ساتھ آزادی کی تحریک میں شدت پیدا ہو چکی تھی اور تخلیق کاروں نے تخیل کو سماجی کروٹوں اور عارضی بندھنوں کی پرکھ کے لیے ایک حربے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ نذر سجاد حیدر اردو کی خواتین ادیبوں میں سرفہرست نظر آتی ہیں۔ حالانکہ اس وقت اردو کے کئی بڑے افسانہ نگار اور ناول نگار منظر عام پر آ چکے تھے۔ کئی خواتین بھی شہرت اور اچھے خیالات کے ساتھ ابھر چکی تھیں۔ ان میں سیاسی شعور بھی تھا اور آزادی نسواں کا جذبہ بھی اس لیے شادی سے پہلے سے ہی وہ سیاسی جلسوں میں شریک ہوتیں اور اپنے خیالات کا اظہار بے باکانہ طور سے کرتیں۔ لاہور، دہلی، آگرہ، بمبئی، کلکتہ اور بھوپال وغیرہ میں

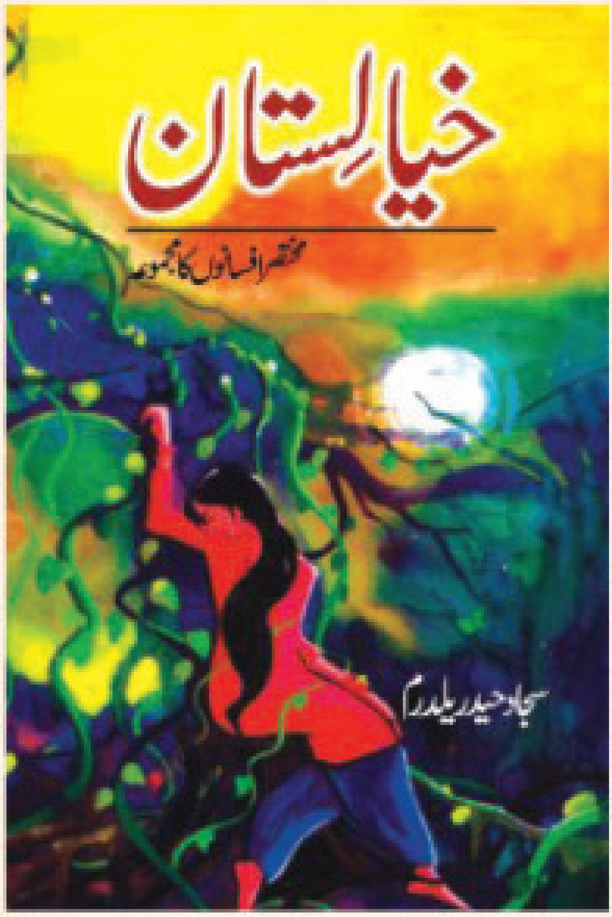

اردو کانفرنس میں اکثر ان کی شہرت ہوتی رہی۔

قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

''1933ء میں نذر سجاد حیدر نے پردہ ترک کر دیا اور ترک موالات کے زمانے میں کھادی تحریک میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ یلدرم کے ہمراہ مشرق وسطیٰ کی سفر بھی کیا۔''

(گِلِنڈ نڈی۔ قرۃ العین حیدر، ص:37)

نذر سجاد حیدر نے اس وقت پردہ ترک کر دیا۔ جب مسلم خواتین اس کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں۔ علامہ اقبال انھیں ''آقا زادی'' کہا کرتے تھے۔ یعنی رسول اللہ کی اولاد۔ قرۃ العین کی ایک ایک تحریر سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال دونوں نذر سجاد حیدر کی آزاد خیالی سے نالاں تھے۔ اس تعلق سے ان کے ماموں (اُلن) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ان دونوں کی ناراضگی کی وجہ شاید یہ ہو کہ ''آل رسول'' ہو کر بے پردہ ہو گئیں جب نذر سجاد حیدر علی گڑھ سے لاہور گئی تھیں تو علامہ اقبال نے انھیں اپنے انارکلی والے مکان پر کھانے کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے پردہ ترک کیا تھا۔ اس لیے علامہ اقبال کے سامنے نہیں گئیں تھی کہ انھیں افسوس ہوگا قرۃ العین حیدر نے اپنی ایک کزن کے یہ الفاظ بھی نوٹ کیے ہیں۔ جنھوں نے کہا تھا کہ:

''بڑی اماں میں کتنی ہمت تھی اپنے زمانے کے giants کو مستقل Deny کرتی رہتی تھیں۔'' نذر خالہ اس زمانے کی فیشن ایبل سوسائٹی کی لیڈ تھیں۔

(کار جہاں دراز ہے۔ قرۃ العین حیدر)

نصرت جہاں

سارہ حمید احمد

پرواز کرو ہر پرواز سے آگے
رکھنا ہے قدم وقت کی آواز سے آگے

خواب دیکھنا ایک بات ہے اور اس خواب کو تعبیر بنتے دیکھنا یا اسے تعبیر سے ہمکنار کرنے کے لیے جدوجہد کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ عام طور پر ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اس معاشرے کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ کسی نہ کسی سطح پر سمجھوتہ ضرور کرتے ہیں اور یہی سمجھوتہ ہمیں عام انسان بنا کر کھڑا کر دیتا ہے کیونکہ کچھ خاص کرنے کے لیے، کچھ بڑا کرنے کے لیے معاشرے کو کچھ دینے کے لیے، معاشرے کا ذمہ دار شہری بننے کے لیے کچھ ایسا ضرور کرنا پڑتا ہے جسے اکثر لوگ بغاوت کا نام دیتے ہیں لیکن پھر اسی باغیانہ عمل کے نتائج نہایت دوررس ہوتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کی آدھی آبادی کے مسائل ہر دور میں پہاڑ جیسے رہے ہیں انھیں سماج کا تخلیق کار ہونے کے باوجود عضو معطل بھی سمجھا گیا، ناقص العقل بھی قرار دیا گیا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اسے ایک ایسے پنجرے میں قید کر دیا گیا جس کی تیلیوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اس نے پہلے تو خود کو لہولہان کیا اور پھر اس حبس دوام کو اپنا مقدر سمجھ کر اس پر قانع ہوگئی۔ قناعت وصبر ایک بہت بہتر جذبہ ہے۔ لیکن معاشرے اور اپنی نسلوں کی بقاء کے لیے کبھی کبھی اس جذبہ سے انحراف بے حد ضروری ہے اور ہر دور اور ہر معاشرے میں خواتین کے ساتھ ظلم وجبر کو روا رکھا گیا اور ہر دور میں اس رویہ کے خلاف بغاوت کرنے والی خواتین بھی پیدا ہوتی رہیں اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی یہ آدھی آبادی کلی طور پر اسیر نہ ہو سکی۔

سارہ حمید احمد ملک کی وہ مایہ ناز بیٹی ہے جس نے اپنی لگن، محنت اور شوق کو یکجا کر کے پرواز کے آسمان پر تابندہ ستارہ بن گئی، ایک ایسا روشن ستارہ جس کی پیشانی پر ''مسلم'' بھی لکھا ہوا اور ''خاتون'' بھی لیکن اس نے خود کو لوگوں کی رائے کے دار پر مصلوب نہیں کیا۔ طعن وتشنیع کی فکر نہیں کی اور یہ ثابت کر دیا کہ جہاں چاہ وہاں راہ۔

سپنوں کی پرواز لامحدود ہے اور ان کا توسیع غیر یقینی ہے، انسان کی آنکھ اور دماغ کھل کر خواب دیکھ سکتے ہیں اور اگر آنکھوں میں کوئی منزل ہے تو راستہ کتنا بھی مشکل ہو، جذبہ اور خود اعتمادی کے سہارے راستہ طے کر ہی لیا جاتا ہے۔

سارہ حمید احمد نے بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ ان کو پائلٹ بننا ہے۔ لیکن بھارت میں ایک عورت کو اتنی آزادی ہمارا معاشرہ نہیں دیتا اور اگر آپ مسلمان ہیں تو یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

آج سارہ حمید احمد بھارت کی پہلی مسلم خاتون پائلٹ ہیں جو آسمان میں ہوائی جہاز کو اڑا رہی ہیں۔ ان کا خواب پورا ہو چکا ہے۔ بھارت کی پہلی مسلم جہاز پائلٹ بن کر انھوں نے تاریخ رقم کر دی ہے۔ بھارت میں اس سے پہلے ایئر ہوسٹس تو بہت سی خواتین بن چکی ہیں مگر سارہ حمید ملک کی پہلی مسلم خاتون پائلٹ بنی ہیں۔

خود سارہ اپنے ارد گرد کے لوگوں سے کئی بار ایسا کہہ چکیں ہیں اور اپنے ایک انٹرویو میں بھی انھوں نے کہا کہ ''میرے مسلم ہونے سے مجھے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لوگ مجھے کہتے تھے کہ میں ایسا نہیں کر پاؤں گی۔ میں جب اپنا نام بتاتی تھی تو ٹریننگ میں بھی مجھے الگ

طرح سے دیکھا جاتا تھا اور جب سے 11/9 ہوا ہے، تب سے مشکلیں کچھ زیادہ بڑھ چکی ہیں۔ اس سب کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری۔ طے کر لیا تھا کہ بننا تو پائلٹ ہی ہے۔ آج بھارت کی پہلی خاتون پائلٹ ہوں تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

ان کے والد بنگلور میں اپنی فوٹو گرافی کی فرم چلاتے ہیں۔ انھوں نے ایک 'اسلامی بلاگ' پر اپنی بیٹی کے خواب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا، سارہ بچپن سے ہی عام لڑکیوں سے مختلف تھی اور کچھ بڑا کرنا چاہتی تھی۔ اسکول کے دنوں سے ہی وہ یہ جذبہ لیے گھومتی تھی۔ پہلے پہل جب اس نے کہا کہ اسے پائلٹ کی ٹریننگ لینی ہے تو تھوڑی ہچکچاہٹ ہوئی تھی لیکن پھر میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ بیٹی کو اس کے خواب پورے کرنے دیے جائیں۔

سارہ نے اپنی ٹریننگ 2007 میں امریکہ سے شروع کی۔ وہاں ان دنوں ایک خاص مذہب کے لوگوں کو امریکہ سے ویزا نہیں مل پا رہا تھا پر سارہ کو یہاں کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوئی. ایسا لگتا ہے کہ جیسے اوپر والا بھی ان کی مدد کر رہا تھا۔

اس نے اپنی محنت اور تندہی سے اپنے خوابوں کو حقیقت کی زمین پر اتارا ہے۔ آج جو انسان یہ سوچتا ہے کہ ہم اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے اپنے خواب کی تکمیل کو پورا نہیں کر سکتے ہیں، ان سب کو سارہ حمید احمد سے سبق سیکھنا چاہیے کہ مصیبت میں بھی کس طرح منزل تک سفر طے کیا جاتا ہے۔

اقبال کے لفظوں میں:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

داستاں گو آیا ہے

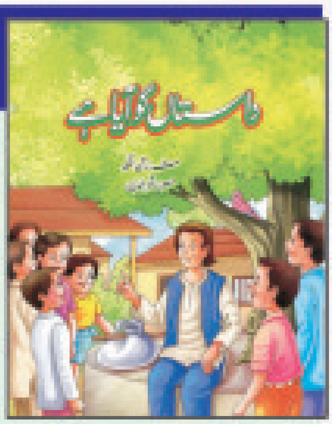

"داستاں گو آیا ہے" قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے تازہ شائع ہونے والی بچوں کی کتابوں میں سے ایک کتاب کا نام ہے جس کے مصنف اردو کے مشہور و معروف ادیب رتن سنگھ ہیں۔ رتن سنگھ ان معروف ادیبوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اردو زبان اور اس کی ترویج کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں ملک و قوم کے لیے بے حد اہم پیغامات پوشیدہ ہوتے ہیں اور اسی لیے اردو کا قاری ان کو نہایت احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں بھی موصوف نے نہایت خوبصورتی سے جنگل کے کاٹے جانے پر احتجاج کیا ہے اور ایک لکڑ ہارے کو کردار بنا کر بے دریغ کٹ رہے درختوں کا ماتم کیا ہے۔ جنگل کے حسن کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "جنگل کیا تھا زندگی کا ہنستا ہوا چہرا تھا، ہر طرف خوشیوں کا پہرہ تھا" بڑا ادیب وہ ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ اس کی تحریر کس طبقے کے لیے ہے۔ رتن سنگھ نے یہ کہانی بچوں کے لیے لکھی ہے لہٰذا اس کہانی کی زبان بھی نہایت آسان ہے اور انھوں نے نہایت مشاقی سے محض دو کردار "داستان گو" اور "لکڑ ہارے" کے ذریعہ روایتی داستان گوئی کا منظر بھی خلق کر دیا اور اپنا پیغام بھی دے دیا کہ "جنگل زندگی کی بیش قیمت دولت ہے۔ صاف لفظوں میں کہوں تو یہ زندگی کی بنیادی ضرورت ہے یوں سمجھو کہ ان کے دم سے ہی زندگی کے گھر میں سویرا ہے۔ یہ نہیں ہوں گے تو وہی آخرت کا سا اندھیرا ہے"

16 صفحات پر مشتمل اس کہانی کو مصور فجر الدین نے نہایت خوبصورت و دلآویز رنگوں سے باتصویر کیا ہے۔ خوبصورت آرٹ پیپر پر ان وضاحتی تصویروں کے درمیان 18 اور 20 فونٹ سائز میں متن بچوں کو خود بخود اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ ٹی وی اور انٹرنیٹ کی رنگین چکا چوندھ سے مقابلہ کرتی یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعہ شائع شدہ ہزاروں کتابوں میں اپنی الگ شناخت رکھتی ہے اور قیمت محض -/25 روپیہ ہے۔

شاعرات کے منتخب اشعار

اٹھا ہے محفلِ ہستی سے اعتمادِ وفا
کہو کسی سے کہ رسمِ جفا پہ ناز کرے
خدا بھی ہو تو بھی کوشش نیاز نہ کر
اگر وہ تجھ سے کوئی احتیاط راز کرے

زیب عثمانیہ

تم گئے ہو تو زمانہ ہی چھنا جاتا ہے
زندگی جیسے کہ وابستۂ غم ہے دیکھو
ہم تجھ سے دور ہو کے ہوئے ہیں قریب تر
ہر راستے سے ہو کے تری رہ گزر گئی

زبیدہ تحسین

تری نگاہ کی جنبش میں اب بھی شامل ہیں
مری حیات کے کچھ مختصر افسانے
دل بجھنے لگا آتشِ رخسار کے ہوتے
تنہا نظر آتے ہیں غمِ یار کے ہوتے

زہرہ نگاہ

کچھ ملتفت ہوئی ہے نگہِ ناز فتنہ ساز
کچھ مے کدے میں روشنی آئی نظر مجھے
لے گئیں لوٹ کر ساز و سامانِ دل
ایک لمحے کی جاں سوز برنائیاں

ساجدہ زیدی

ہمیں بھی آتا ہے تخلیقِ کائنات کا فن
وہ ایک مٹھی زمیں دے جہان سے پہلے
اب اپنا ہر سلیقہ کیوں خطاکاری میں آتا ہے
کہ سچا عشق بھی طرزِ گنہگاری میں آتا ہے

شہناز نبی

میری انگلی کی انگوٹھی میں لگی پتھر کی آنکھ
اور دریچے میں سمٹ آئی مچلے بھر کی آنکھ
آج اس راہ سے وہ گزرا ہے
آج میں فرش نہ دھونا چاہوں

حمیرا رحمٰن

خود میں نے اپنے سارے پرندے اڑا دیے
دل اب میرا قفس تو نہیں خواہشات کا
میں صبح و شام چڑیا کی طرح چہکتی رہوں جیسے
مکمل ہو بھی میرا بھی گھر آہستہ آہستہ

سکینہ ساجد پنہاں

عجب عجب سے سوالوں کی دل کو وحشت تھی
یہ اس کے لہجے میں آج اتنی کیوں مروت تھی
میری ہستی کو وہ جیسے چاہے ویسے حل کرے
ضرب دے مجھ کو بھی تقسیم کر جائے مجھے

نسیم سید

وہ لڑکیاں کہ جو لگتی تھیں سادہ تحریریں
پڑھی گئیں تو انوکھی پہیلیاں نکلیں
میں کسی اور کو دیکھوں بھی تو دیکھوں کیسے
اس کے خوابوں کی ان آنکھوں پہ نگہبانی ہے

ملکہ نسیم

ٹوٹی چوڑی ٹھنڈی لڑکی باقی عمر
سبز بدن پتھرائیں آنکھیں نیلے ہونٹ
اتنا بولو گی تو کیا سوچیں گے لوگ
رسم یہاں کی یہ ہے لڑکی سی لے ہونٹ

عشرت آفرین

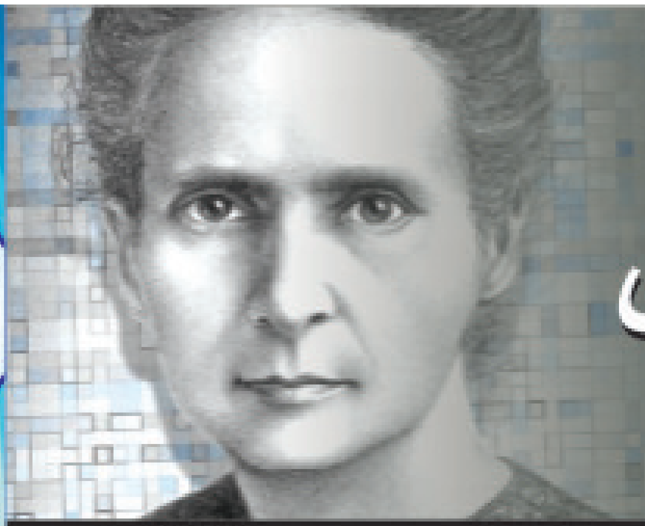

میڈم کیوری

میڈم کیوری 1867 میں پولینڈ میں ایک کسان کے گھر میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والدین نے میڈم کیوری کا نام مانیا اسکووڈوسکا رکھا۔ آپ کے والد وارسا ہائی اسکول میں علم طبعیات کے استاد تھے۔ اس طرح گھر کا ماحول کھیتی باڑی کے علاوہ پڑھنے لکھنے کا بھی تھا۔ بچپن کی زندگی خوش وخرم گذر رہی تھی۔ ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی میں ہوئی۔ 1877 میں دس سال کی عمر میں آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور مانیا پر گھر کی ذمہ داریاں آ پڑیں۔ اس زمانے میں پولینڈ پر پروشین فیزار نام کا ظالم حاکم حکومت کرتا تھا۔ مانیا کے والد نے اس ظالم حاکم کے خلاف آواز بلند کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ان ساری پریشانیوں اور تکلیفوں کے باوجود مانیا نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اور اپنی جماعتوں میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتی رہیں۔ 16 سال کی عمر میں مانیا نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اور گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد مانیا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش مند تھیں۔ لیکن گھر کے حالات اور مالی تکالیف کی وجہ سے وہ یونیورسٹی نہیں پہنچ سکیں۔ انھوں نے دولتمند لوگوں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کیا۔ اس آمدنی سے وہ گھر کا خرچ اور تعلیم کے اخراجات پورے کرتی رہیں۔ مانیا کی ایک بڑی بہن بھی تھیں۔ انھوں نے علم طب میں ڈگری حاصل کی۔ اور اسی شعبہ سے تعلق رکھنے والے لڑکے سے شادی بھی کر لی۔ مانیا کی عمر اس وقت 23 سال کی تھی۔ ان کی بہن نے مانیا کو مالی امداد دینا شروع کی۔ اس طرح اب حالات ایسے ہو گئے کہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر سکیں۔ مانیا کی دلی خواہش پوری ہونے کا اب وقت آیا تھا۔ اب ان کا سارا وقت کتابوں کے مطالعے میں صرف ہو جاتا تھا۔ وہ تنہا رہتی تھیں۔ اور تعلیم حاصل کرنے میں مصروف رہتی تھیں۔ ان کے استاد مانیا کی بہترین کارکردگی پر بہت خوش ہوتے تھے۔ اور ان کی تعریف بھی کیا کرتے تھے۔ مانیا نے 26 سال کی عمر میں علم طبعیات میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ اور ساتھ ہی علم ریاضیات میں بھی ماسٹر ڈگری حاصل کی۔

مانیا کی زندگی میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب ان کی ملاقات پیری کیوری کے ایک سائنسداں سے ہوئی۔ ان دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا اور دونوں سائنسداں تحقیقی کاموں میں مصروف بھی ہو گئے۔ اس طرح مانیا اسکوڈووسکا میری کیوری بن گئیں۔ پیری کیوری پیرس کے اسکول آف کیمسٹری اینڈ فزکس کے سربراہ تھے۔ آپ نے پیزوالیکٹری سٹی پر تحقیق کی تھی۔ دونوں سائنسدانوں کے شوق تحقیقی کاموں میں تھے۔ اس لیے آپ دونوں نے ابتدا میں بیکیورل شعاعوں پر کام شروع کیا۔ میری کیوری نہ صرف گھر کے کاموں میں مصروف رہتیں۔ ساتھ میں علم طبعیات میں ڈاکٹریٹ کے لیے بھی کیا کرتی تھیں۔ تحقیق کے دوران انھوں نے تھوریم دریافت کیا۔ جو بیکورل شعاعیں میں خارج کرتی تھیں۔ ان سائنسدانوں نے اس عمل کو سب سے پہلے دریافت کیا۔ ریڈیو ایکٹی وٹی (Radioactivity) کا نام دیا۔ اسی دوران انھوں نے یورینیم سے شعاعوں کے خارج ہونے کی تصدیق بھی کی۔

میڈم کیوری نے گھر کے ایک گوشے میں ایک تجربہ گاہ بھی بنائی۔ اس تجربہ گاہ میں ان دونوں سائنسدانوں نے آکسائڈ آف یورینیم (پچ بلینڈ) پر تحقیقی کام کیا۔ آکسائد آف یورینیم کافی مہنگا ملتا تھا۔ اس لیے ان سائنسدانوں نے ریزیڈیو آف پچ لینڈ پر کام کرنا شروع کیا۔ ان دونوں سائنسدانوں نے رات دن محنت کی۔ اور چار سال کی مستقل محنت کے بعد پولونیم اور ریڈیم جیسے طاقتور اشیاء کی دریافت کی۔ اس دریافت سے دونوں سائنسدانوں کو عالمی شہرت ملی۔ نوبل کمیٹی نے میری کیوری اور پیری کیوری کی اس اہم دریافت کو سراہا۔ اور ان دونوں کو سال 1903 کے مشترکہ نوبل انعام سے نوازا۔ ان کی اس اہم دریافت کی دھوم دنیا بھر میں گونج اٹھی۔ اس کا استعمال ان بیماریوں میں بھی کیا جاسکا جو لا علاج تھیں۔

ریڈیم جیسی اشیاء کا استعمال کینسر جیسے موذی مرض میں بھی کیا جاتا ہے۔ ان سائنسدانوں نے اپنی اس دریافت کو پیٹنٹ نہیں کرایا۔ اور انسان کی فلاح و بہبود کے لیے اور ان کی جسمانی پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے استعمال کیے جانے کی کھلی اجازت دی۔ کہا جاتا ہے کہ اگر یہ سائنسداں اپنی اس دریافت کو پیٹنٹ کراتے تو وہ بھی دنیا کے مالدار ترین لوگوں میں شمار ہو سکتے تھے۔ ان سائنسدانوں کو سوربون اکیڈمی آف سائنسیز کے رکن کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ ان کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اور فروغ سائنس کے لیے اس اکیڈمی نے مزید تحقیق کے لیے اعلیٰ پیمانے کی جدید طرز کی تجربہ گاہ بھی فراہم کی۔ زندگی بہتر اور تحقیق میں مصروف تھی کہ اچانک پیری کیوری کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ میری کیوری کے لیے یہ حادثہ برداشت کے باہر تھا۔ انھوں نے پھر بھی اپنی تحقیقی کاموں کو جاری رکھا۔ اور ریڈیم کا استعمال ٹیومر اور کینسر جیسے

امراض میں جاری رکھا۔ میری کیوری کو نوبل کمیٹی نے 1911 کے لیے ایک بار پھر علم کیمیا کے لیے نوبل انعام سے نوازا۔ شاید دنیا میں ایسے سائنسداں کم ہی ہوں گے جنھیں زندگی میں دوبار نوبل انعاموں سے نوازا گیا ہو۔ 1914 کی عالمی جنگ میں میری کیوری نے فوجیوں کی تکلیف کو دور کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کی۔ زندگی میں مسلسل کام کاج اور تحقیق اور ریڈیو ایکٹیو مادوں کے بیچ کام کرنے کی وجہ سے میری کیوری کے جسم پر برے اثرات پڑنے لگے۔ ان کے اجزائے ریشہ پر مسلسل افشاں سے خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ اور وہ برابر بیمار رہنے لگیں۔ 67 سال کی عمر میں 1934 کو میڈم کیوری کا بھی انتقال ہو گیا۔ دنیا اور سائنسی برادری نے ایک اہم سائنسداں کھو دیا۔ ان کی سائنسی خدمات اور تحقیق دنیا بھر میں سراہی گئی۔ اعلیٰ پیمانے کی سائنسداں ہونے کے باوجود انھوں نے زندگی کے آخری سفر میں تحقیقی کاموں کو جاری رکھا۔ ان کی اس تحقیق سے انسانی جسم کی تکلیفوں کو رفع کیا جانا ممکن ہو سکا۔ میڈم کیوری کا نام تمام مشہور سائنسدانوں کے ساتھ ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ جنھوں نے اپنی پوری زندگی سائنس کے فروغ میں صرف کی۔ اور یہ دنیا ان کو کبھی بھی بھلا نہ سکے گی۔ (ماخوذ: عظیم سائنسداں)

سیاہ چادر کے پار

انجم فریدی

اس سنہری رو پہلی دنیا کی ایک بے حد حساس مخلوق کا نام عورت ہے۔ جو ہر دور میں انسانی معاشرے کی مرکزی کردار رہی، جس نے ہر معاشرے کو اپنی انتھک جدو جہد سے قابلِ تقلید و قابلِ اعتماد بنایا، جس نے مردوں کے اندر سے حیوانی جبلت کو نکال کر اسے معاشرے کے لیے کار آمد بنایا۔ خدا کی بنائی ایک ایسی مخلوق جس نے کارِ خدائی میں معاونت کر کے نبیوں اور رسولوں تک کو اپنی کوکھ کی گھنی چھاؤں میں پرورش و پرداخت کیا۔ ان کی زباندانی کو صیقل کیا اور اپنے لہو کے جوہر کو ان کی شریانوں میں منتقل کر کے انھیں آہن و آتش کا ایسا پیکر بنا دیا جنھوں نے بڑی سے بڑی مصیبت، سازش اور ظلم و جبر کو ہوا کے دوش پر اڑنے والے غبار سے زیادہ اہمیت کبھی نہیں دی اور دہر خداوندی پر کامیاب و کامران ہوئے۔ لیکن اس روزِ روشن کی طرح عیاں سچائی کے منکرین بھی ہر دور میں موجود رہے۔ انھوں نے مریم و سیتا کے قصیدے بھی پڑھے انھیں درگا و پاروتی بنا کر پوجا بھی۔ ماں کے قدموں تلے جنت کا ورد بھی کیا اور درس

> ”خدا کی بنائی ایک ایسی مخلوق جس نے کارِ خدائی میں معاونت کر کے نبیوں اور رسولوں تک کو اپنی کوکھ کی گھنی چھاؤں میں پرورش و پرداخت کیا۔ ان کی زباندانی کو صیقل کیا اور اپنے لہو کے جوہر کو ان کی شریانوں میں منتقل کر کے انہیں آہن و آتش کا ایسا پیکر بنا دیا جنھوں نے بڑی سے بڑی مصیبت ،سازش اور ظلم و جبر کو ہوا کے دوش پر اڑنے والے غبار سے زیادہ اہمیت کبھی نہیں دی اور دہر خداوندی پر کامیاب و کامران ہوئے“

بھی دیا ان کو نصف بہتر بھی کہا لیکن عملی طور پر انھیں ہمیشہ کمزور جانا۔ ان کے نازک اعضا پر قصائد بھی لکھے لیکن انھیں کمزور بھی قرار دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ صبر و ضبط کا پیکر عورت کے دردِ زہ کا مقابلہ کسی کو پہاڑ سے پیسے جانے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس کا اظہار چہرے پر غیر

> ”عورت ہر دور میں ایک ”شئے“ رہی جسے حاصل کرنے کی ہوڑ لگی رہی لیکن وقتی ضرورت کے تحت، افزائشِ نسل کے لیے یا گھر کی دیکھ بھال کے لیے اسے کبھی بھی معاشرے کا حقیقی نصف بہتر تسلیم ہی نہیں کیا گیا“

ارادی طور پر ابھر آنے والے پسینوں کے قطروں سے زیادہ نہیں کرتی۔ لیکن مرد اساس سماج نے نہ جانے کس طرح اس پیکرِ جانفشانی کو کبھی اس کا جائز مقام نہیں دیا اور اسے ضمنی کردار بنا کر رکھ دیا۔ جس گھر میں وہ پیدا ہوتی ہے، گڑیوں سے کھیلتی اور بھائیوں کی خدمت کرتے بڑی ہوتی ہے اسی گھر کے در و دیوار اس کے لیے یکا یک اجنبی ہو جاتے ہیں۔ نئے گھر، نیا ہمسفر اور نئے سے زیادہ اجنبی افراد نئے رشتوں کے ساتھ اس کے سامنے آتے ہیں اور ان سے اسے مانوس ہونا پڑتا ہے، فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ایک ایسے گھر کی بنیاد رکھنی پڑتی ہے جو اس کا کبھی بھی نہیں ہوتا کیونکہ ایک خاص عمر آتے آتے اسے پھر اس گھر کی اور اس کے نئے مہمانوں کی دربانی کرنی پڑتی ہے۔ اسے بیک وقت کتنے کردار ادا کرنے پڑتے ہیں اس کا شمار ممکن نہیں اور ہر کردار کو اس خوبی کے ساتھ نبھانا پڑتا

ہے کہ اس میں بناوٹ کا شائبہ بھی نہ ہو۔

دنیا نے ترقی کے اتنے مدارج طے کر لیے۔ ان گنت تحریکوں نے جنم لیے، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں تنظیمیں بنیں لیکن عورت ہر دور میں ایک ''شے'' رہی جسے حاصل کرنے کی ہوڑ لگی رہی لیکن وقتی ضرورت کے تحت، افزائش نسل کے لیے یا گھر کی دیکھ بھال کے لیے اسے کبھی بھی معاشرے کا حقیقی نصف بہتر تسلیم ہی نہیں کیا گیا گو کہ اس نے دنیا کے تمام معاملات میں مردوں کے شانہ بشانہ اور زیادہ تر آگے بڑھ کر معاشرے، تہذیب و تمدن اور اس کے چپ وراست میں کھلے اور چھپے دشمنانِ تہذیب کو دعوت مبارزت ہی نہیں دی انھیں ملیا میٹ بھی کیا۔ کیا کوئی بھی معاشرہ اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ آج بھی ہمارے معاشرے کی عورتیں اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے مردوں سے زیادہ فکر مند ہوتی ہیں۔ وہ تعلیم بھی اسی لیے حاصل کرتی ہیں تاکہ ان کے بچے جاہل ماں کی اولاد نہ کہلائیں وہ نوکری اس لیے کرتی ہیں کہ ان کے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ ہونے میں مالی مشکلات کا سامنا کرنا نہ پڑے۔ وہ اپنے گھروں کو اس لیے سجاتی سنوارتی ہیں کہ کوئی مہمان اس کے شوہر کو طعنہ نہ دے۔ وہ انواع واقسام کے لذیذ کھانے اس لیے بناتی ہیں کہ لوگ اس کے شوہر کو پھوہڑ اور بد مذاق بیوی کا شوہر نہ کہے۔ لیکن ان سب کے باوجود مرد کی پسلی سے پیدا ہونے والی اس مخلوق کی مظلومیت پر آنسو بہانا تو دور مردوں نے انھیں کبھی قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ خواتین کو گھروں کی چہار دیواری سے باہر کی دنیا میں لانے کے لیے بھی تحریکیں چلائیں اور یورپ سے ہوتی ہوئی یہ تحریک ہمارے ملک تک آئی لیکن حقوق نسواں کے لیے سرگرم تنظیموں کے ڈی این اے پر بھی مرد اساس سماج کا سایہ رہا اور انھوں نے نہایت چالاکی سے گھروں کی چہار دیواری سے باہر لا کر عورتوں کا شکار کھیلنا شروع کر دیا۔ ان سے فیکٹریوں کی اشیاء بیچنے کے لیے اشتہار کروائے اور انھیں جسمانی تلذذ کے حصول کا ذریعہ بنا لیا۔ عورتوں کے جسم کو قصائیوں کی دوکان پر ٹنگے ہوئے گوشت کے لوتھڑوں کی طرح ٹانگ دیا۔ انھیں یہ یاد کرانا آج بھی مشکل ہے کہ بدن سے آگے بھی عورتوں کا ایک مکمل وجود ہے، ایک کائنات ہے جس کی نہایت خوبصورت اور اپنی نظام شمسی ہے۔ احساسات وجذبات کے ماسوا سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کرنے کے لیے نہایت قابل اعتماد دماغ بھی ہے۔ دنیا میں پھیلی بدامنی، دہشت گردی، منافرت، علاقائی ولسانی تعصب کے سدِ باب کے لیے بھی خواتین کو ہی آگے آنا ہوگا کیونکہ ان دہشتنا کیوں کا سب سے زیادہ شکار براہِ راست یا بالواسطہ بھی عورتیں ہی بنتی ہیں۔ مشہور شاعرہ فہمیدہ ریاض کی نظم چادر اور چہار دیواری کے چند مصرعے پر اپنی بات ختم کرتی ہوں

حضور اب اس کو ڈھانپ دیجیے
سیاہ چادر تو بن چکی ہے
مری نہیں آپ کی ضرورت
کہ اس زمیں پر وجود میرا
نہیں فقط اک نشانِ شہوت

•••

''بدن سے آگے بھی عورتوں کا ایک مکمل وجود ہے، ایک کائنات ہے جس کی نہایت خوبصورت اور اپنی نظامِ شمسی ہے۔ احساسات و جذبات کے ماسوا سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کے لیے نہایت قابل اعتماد دماغ بھی ہے''

ایک دُکھ بھری کہانی

مصنف: اقبال برکی

''ایک دُکھ بھری کہانی'' اقبال برکی کی بے حد اہم کہانی ہے جس میں موصوف نے نہایت خوبصورتی سے 1984 میں ہوئے بھوپال گیس سانحے کو زندہ کر دیا ہے۔ کہانی کا اسلوب نہایت متاثر کن ہے اور روایتی قصہ گو کی طرح انھوں نے دورانِ کہانی اپنے آس پاس کی منظر نگاری بھی خوب کی ہے۔ بھوپال گیس سانحہ ہماری تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے جس نے محض چند گھنٹوں میں ہزاروں افراد کو موت کی نیند سلا دیا تھا اور کئی ہزار لوگ آج بھی اس کے مہلک اثرات کا زخم لیے تل تل مر رہے ہیں۔ اقبال برکی نے ایک ذمہ دار ادیب کا فرض ادا کرتے ہوئے نہایت آسان زبان میں اس سانحے اور اس سے جڑے حقائق کو پیش کر دیا ہے اور دورانِ واقعہ نگاری پیش بندی کے طریقۂ کار کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔

قومی کونسل کے ذریعہ شائع ادبِ اطفال کے سلسلے میں یہ کتاب دستاویزی حیثیت رکھتی ہے جو بچوں کو تاریخ کے ایک اندوہناک سانحے سے روبرو کراتی ہے۔ اقبال برکی کی اس کہانی کو جناب فجر الدین نے وضاحتی تصاویر سے آراستہ کیا ہے۔ 16 صفحات پر مشتمل کتاب آرٹ پیپر پر چار رنگوں میں شائع کی گئی ہے جو اپنی دلکشی سے بھی بچوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ قیمت صرف پچیس روپے ہے۔

غزالہ فاطمہ

خدیجہ مستور کی فکری اساس اور اردو ناول نگاری

اردو ادب کی تاریخ ہمارے ملک کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، معاشرتی تاریخ کا ایک اہم حصہ رہی ہے۔ انیسویں صدی کے آخری عشرے اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہماری سماجی فکر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس دور میں متوسط طبقہ نے پہلی دفعہ اپنے آپ کو بحیثیت ایک طبقہ پہچانا۔ اس سے پیشتر اردو ادب کا مرکز و محور روسا ہوا کرتے تھے۔ ادب میں متوسط طبقے کی دریافت سماجی فکر کی پہلی دریافت تھی۔ قدیم ادب کو خیالی و رومانی سمجھا جاتا رہا ہے اور نئے ادب کو حقیقت کا ترجمان اور حقیقت پسند قرار دیا جاتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو نئے اور پرانے ادب میں بنیادی فرق مضمون و احساس کا ہے۔

پرانے ناولوں کا دائرہ محدود اور نئے ناول کا دائرہ احساس وسیع ہے۔ اگرچہ اردو ناول کی عمر ڈیڑھ سو برس سے کم نہیں اور اس عرصے میں سیکڑوں ناول لکھے گئے لیکن ان میں گنتی کے ہی کچھ عمدہ اور بہترین ناول ملتے ہیں ۔ زندگی چونکہ بنت نئے انقلاب کی داستان ہے اور زندگی کی طرح ادب میں بھی کئی موڑ آتے ہیں ۔ یہ انقلابات ادب پر بھی دیرپا اثرات مرتب کرتے ہیں۔ سرسید تحریک، رومانی تحریک، اور ترقی پسند تحریک ایسے اہم تاریخی وادبی ابواب ہیں کہ جنھوں نے نئے اندازِ فکر کو جنم دیا۔ انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں جتنی خواتین ناول نگار اردو ادب میں نظر آتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر نے اصلاحی ومقصدی نقطۂ نظر سے ناول لکھے ۔ یہ اصلاحی ومقصدی نقطۂ نظر زیادہ تر درمتوسط طبقے کی خواتین کے حوالے سے تھا۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں جب سماجی وسیاسی حالات میں تبدیلی ہوئی تو ادب بھی اس سے متاثر ہوا۔ اردو ناول میں انیسویں صدی کے خاتمے تک، اخلاقی اور سماجی اصلاح پر زور دیا گیا اور اسی کے ساتھ تہذیبی اقدار کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر بھی ہوئی۔

یہ وہ دور ہے جب مسلم معاشرہ ہی نہیں بلکہ پورا ہندوستانی معاشرہ عورتوں کو کسی بھی قسم کی آزادی دینے کے حق میں نہیں تھا اور حالات اس قدر خراب تھے کہ عورتوں کو واجبی سی تعلیم وہ بھی گھر پر ہی دلا دینا بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ معاشرے میں کوئی ان مجبور عورتوں کی حالت پر غور نہ کرتا تھا، جو مرد اساس معاشرے کے ظلم کا شکار تھیں اور طرح طرح کی صعوبتیں اٹھا کر کسی صورت اپنی زندگی کاٹ رہی تھیں۔ مگر بیسویں صدی میں صورت حال میں تبدیلی آئی اور چند روشن خیال گھرانوں نے عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ دیا۔ محمدی بیگم نے عورتوں کی ایسی گھٹن والی اور مظلوم زندگی پر چھوٹے چھوٹے ناول لکھے۔ جن میں مردوں کے ظلم کی داستان اور عورتوں کے صبر وایثار کی بڑی اچھی تصویریں پیش کیں۔ پھر حیدر آباد کے نواب خاندان کی ایک تعلیم یافتہ خاتون صغرا ہمایوں مرزا نے ''مشیرِ نسواں'' یا ''زہرا'' نام کا ایک ایسا ہی ناول لکھا۔ جس میں جابجا عورتوں کی پستی اور اس کے استحصال کو ختم کرنے کی کوشش ملتی ہے اور انھیں ان کی پستی کے اسباب بتا کر ان میں حوصلہ پیدا کرنے کی فکر بھی پیدا کرتی ہے۔

حیدر آباد سے الگ ہٹ کر نذر سجاد حیدر وغیرہ نے بھی اسی طرح کے ناول لکھے۔ اور عورتوں کو سماجی زندگی میں ایک ترقی یافتہ کردار اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ یہ بیسویں صدی کی ابتداء سے لے کر 1935 تک کا زمانہ ہے جب ان خواتین نے اپنی تحریروں سے

عورتوں میں ایک نئی ذہنی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دراصل انہیں کوششوں سے سماج اور خصوصاً اردو ادب میں تانیثی ادبی فکر کی ابتداء ہوتی ہے۔ جو آگے چل کر عصمت چغتائی، جمیلہ ہاشمی، صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، خدیجہ مستور، رضیہ فصیح احمد، بانو قدسیہ، الطاف فاطمہ، ساجدہ زیدی اور متعدد خواتین ناول نگاروں کی شکل میں ادبی منظرنامے میں نظر آتی ہیں۔

ہندوستان کی آزادی اپنے ساتھ تقسیم کا کرب لے کر آئی۔ پاکستان کا قیام عمل میں آنے کے بعد ہندو پاک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور قتل و غارت گری کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سانحے نے انسان کے خصوصاً ادیبوں کے دلوں پر گہرے نقش چھوڑے اور انھوں نے اس سانحے سے متعلق اپنے کرب کو اپنی تخلیقات میں شامل کرنا شروع کیا۔ صرف مرد افسانہ نگار یا شاعر ہی نہیں بلکہ خواتین افسانہ اور ناول نگاروں نے اسے اپنی کہانیوں میں قلم بند کرنا شروع کیا۔ عورت کا دل نازک اور حساس واقع ہوا ہے اور وہ ایسی کرب ناک اذیت سے مردوں کی نسبت زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین افسانہ نگار اور ناول نگاروں کی تحریروں میں یہ واقعہ اپنی پوری جذباتیت کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔ انھیں خواتین ناول نگاروں میں ایک اہم نام خدیجہ مستور کا بھی ہے۔

خدیجہ مستور کی ہم عصر خواتین ادیباؤں نے جس دور میں اپنا تخلیقی سفر شروع کیا وہ کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں ایک طرف وہ سیاسی اور معاشرتی طور پر ہنگامہ خیز زمانہ تھا وہیں دوسری طرف اسی دور میں کئی فکری اور ادبی نظریات نے جنم لیا۔ ترقی پسند تحریک اس کی ایک مثال ہے جس نے ادب کو زندگی سے قریب تر لانے کی کوشش کی۔ 1947 کے بعد چند سال انتہائی انتشار کے تھے۔ اسی تہذیبی انتشار نے شاعروں، ادیبوں، کو بھی ذہنی اور جذباتی طور پر متاثر کیا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اردو کے زیادہ تر ادیبوں نے اس خون آلود آزادی کا خیر مقدم نہیں کیا بلکہ اسے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کے روپ میں سامنے لانے کی کوشش کی۔ فیض کی نظم، صبح آزادی، منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ اور کھول دو، راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ لاجونتی، راما نند ساگر کا ناول، اور انسان مرگیا، اسی طرح کی ایک کوشش تھی۔

اسی طرح خدیجہ مستور نے بھی اس کریہہ منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسے اپنے ناولوں میں بیان کیا۔ خدیجہ مستور 11 دسمبر 1927 بریلی میں پیدا ہوئیں۔ لیکن تقسیم ہند سے قبل ہی ان کا خاندان لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ انہوں نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔ پہلا ناول " آنگن " 1962 میں اور دوسرا ناول ''زمین'' 1982 منظر عام پر آیا۔ انہوں نے اپنے ماحول کی حقیقت پسندانہ اور معنی خیز عکاسی کی ہے۔ ''آنگن'' کا بنیادی موضوع ہندوستانی معاشرے کی گھریلو زندگی پر سیاسی اثرات ہیں۔ مصنفہ نے ایک متوسط طبقے کی عکاسی کی ہے جو ملکی سیاست کی پر پیچ گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے تباہی کے دہانے پر آن کھڑا ہوا ہے۔ ''آنگن'' کے مرد سیاست کی خاطر گھربار سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ وہ سیاسی تحریکوں میں جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ خانگی جھگڑے، اور رشتے ناتے میں ان کا ذکر بھی اس ناول میں ملتا ہے۔

ناول ''آنگن'' ایک ایسی علامت نظر آتا ہے جو اپنے اندر اس زمانے کی بھرپور جدوجہد کے اثرات علامتی انداز میں سمیٹے ہوئے ہے۔ بچا کا ''آنگن'' صرف گھریلو زندگی کی عکاسی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس دور کی حالت کو بیان کرتا ہے جو دوسری جنگ عظیم سے تعلق رکھتی تھی۔ ملک کی سیاست نے گھریلو زندگی پر ایسا اثر ڈالا کہ خاندان کے خاندان سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے اور ایک ہی گھر میں رہنے والے افراد مختلف نظریات کے پابند ہو جانے کے باعث ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔

خدیجہ مستور نے اپنے دوسرے ناول ''زمین'' میں قیام پاکستان کے وقت اور اس کے بعد جو حالات تھے ان کو بڑی فن کاری کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ ''آنگن'' قیام پاکستان کے بعد کی ابتدائی زندگی کے حوالے

سے تخلیق شدہ ناولوں میں اہم ناول ہے۔ خدیجہ مستور کا دوسرا ناول ''زمین'' وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے ناول ''آنگن'' ختم ہوا تھا۔ ''زمین'' کو ''آنگن'' کی توسیع بھی کہا جاتا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے تاریخی شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے اقدار کی شکست و ریخت اور معاشرتی تبدیلیوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ جنھوں نے انسانی زندگی میں مسائل پیدا کیے جن میں سب سے بڑا مسئلہ آدرشوں کی شکست و ریخت ہے۔ اس ناول میں عالیہ کی جگہ ساجدہ نے لے لی ہے۔ ناول یہ تاثر دیتا ہے کہ تاریخ کے دھارے پر بہتے ہوئے انسان کیا کیا منصوبے بناتا ہے اور کنارے آ لگنے پر سوچ بچار اور خوابوں کے تمام مناظر بدل جاتے ہیں۔ لیکن ''زمین'' میں تاریخ اور سیاست میں کردار اتنے ملوث نہیں جتنے کہ آنگن میں ملوث تھے۔ شاید وہ تحریک کا ابتدائی اور یہ انتہائی دور تھا اور یہ تنظیم کا مرحلہ ہے۔ تاہم مصنفہ کا خلوص اور سادگی لائق ستائش ہے۔ انھوں نے پاکستان بننے کے بعد کے حالات کو جو تاریخ اور سیاست سے اپنا وجود پاتے ہی گرفت میں لینے کی سعی کی ہے۔ اس طرح ''آنگن'' اور ''زمین'' میں اگر قصے کی گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہوگا کہ خدیجہ مستور تاریخ اور سیاست کے دیے ہوئے دکھوں کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔ لیکن ''آنگن'' کا وسیع کینوس ''زمین'' سے ارفع ہے۔

''آنگن'' کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن ''زمین'' قصہ گوئی، اسلوب اور سیاست کے حوالے سے مدغم فنی اظہار تخلیقی سطح پر خدیجہ مستور کی حیثیت کو مسلّم کرتا ہے۔ ''زمین'' اگرچہ ''آنگن'' کے مقابلے میں کم اہمیت کا حامل ہے۔ تاہم ''زمین'' میں اخلاقی اقدار کے زوال کا المیہ بہتر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ تکنیکی اعتبار سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ منظر نگاری کے شیڈز زیادہ موثر طور پر نہیں بھرے جا سکے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ خدیجہ مستور کو موت نے مہلت ہی نہ دی۔ اس بحث سے قطع نظر ''زمین'' ایک پورٹریٹ ہے۔ جس کے نقوش سیدھے سادے مگر اپنی جگہ بھرپور معنویت کے حامل ہیں۔

ناول ''آنگن'' اور ''زمین'' فسادات کے موضوع پر لکھے گئے ہیں اور ان کے کرداروں کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ لیکن ان کی ذہنی سطح ،خیالات اور رویے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ آنگن'' کی عالیہ اگرچہ ''زمین'' کی ساجدہ کی طرح حساس ہے۔ لیکن دونوں کے رویے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ عالیہ میں خود اعتمادی کی کمی ہے۔ وہ سب سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن جرأت کی کمی اور لڑائی جھگڑے کے خوف سے وہ ایسا نہیں کر پاتی۔ اسے کسی خاص شخص سے محبت نہیں لیکن اس کے ذہن میں ایک آئیڈیل کا تصور ہے۔ آئیڈیل کی خصوصیات اسے جمیل بھیا کے ڈاکٹر اور صفدر میں نظر نہیں آتے تو وہ اکیلے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ جب کہ ''زمین'' کی ساجدہ عالیہ کے برخلاف پر اعتماد اور باہمت لڑکی ہے۔ ہجرت کے بعد اسے مالک کے گھر میں پناہ لینی پڑتی ہے اور وہ وہاں بھی اپنی حیثیت منوالیتی ہے۔ ہجرت کے بعد وہ صلاح الدین سے بچھڑ جاتی ہے، اپنے تحفظ کے لیے اسے ناظم سے شادی کرنی پڑی، لیکن عالیہ کی طرح تنہائی اس کا مقدر نہیں بنتی۔ اس کے ساتھ ناظم اور اس کے بچے تھے۔

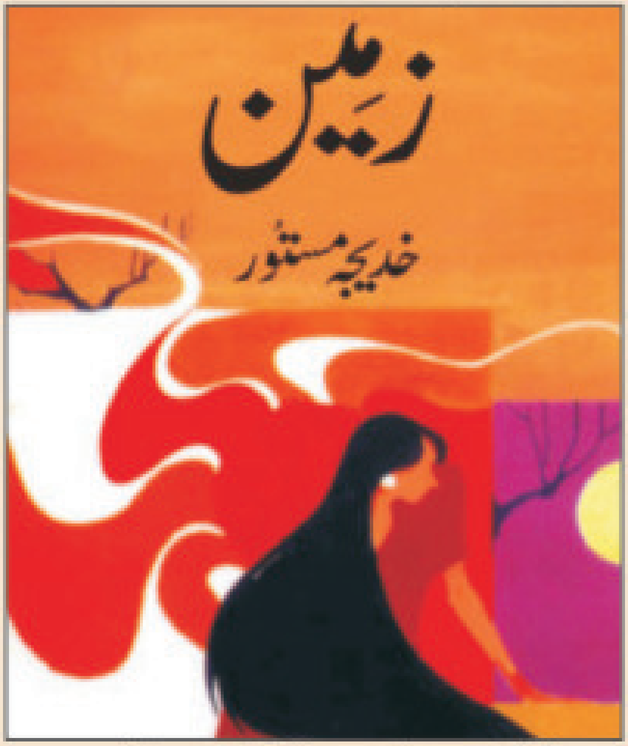

مجموعی طور پر یہ ناول مہاجرین کے مختلف رویوں کا آئینہ دار ہے جو مثبت اور منفی دونوں طرح کے ہیں۔ ناول میں عورت کی معاشرتی حیثیت کو نمایاں طور پر دکھایا گیا ہے۔ خاص طور پر تاجی کا کردار ناول کے موضوع کے لحاظ سے اہم ترین کردار ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت چاہے آزاد ملک کے معاشرے کی کیوں نہ ہو، اگر وہ کمزور اور بے بس ہے تو لوگ اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور پھر بعد میں چھوڑ دیتے ہیں۔ تاجی جس کی ماں نے اسے اس امید پر آزاد ملک پاکستان بھیج دیا تھا کہ اپنے ملک میں وہ بالکل محفوظ رہے گی اور کوئی بھی شریف مسلمان مرد اس سے شادی کر لے گا۔ لیکن پاکستان میں کاظم نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ہندوستان میں کوئی غیر مسلم نسلی تعصب کی وجہ سے کرتا۔

ناول میں دوسری حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں میں جن لوگوں نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی یا مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے ان میں سے بیشتر افسران نے مہاجرین کے مسائل کو حل کرنے اور ملک کی ترقی کے لیے سوچنے کے بجائے غیر قانونی طریقے سے اپنی حیثیت اور حقیقت کو بدلا۔ بعض مہاجرین ایسے تھے جنھیں ان کی حیثیت کے مطابق جائیداد نہ مل سکی تو وہ لوگ صرف روحانی طور پر زخمی نہیں ہوئے بلکہ وہ معاشی طور پر بھی تنگ دستی اور فاقہ کشی کا شکار ہوئے۔ یہ پاکستانی معاشرے کی بدنصیبی کی ابتداء تھی۔

''زمین'' حقیقت نگاری کی روایت میں تحریر کیا ہوا ایک معاشرتی ناول ہے۔ جس میں تمام کردار ایک گھر میں رہتے ہوئے متضاد، طبقاتی رویوں اور خواہشوں کا اظہار کرتے ہیں۔ صلاح الدین امراء اور جاگیر داروں کے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ کاظم کا تعلق بیورو کریٹس کلاس سے ہوتا ہے تاجی اس عہد کی کمزور عورت کی داستان ہے۔ ناول میں خدیجہ مستور نے ساجدہ کی زبانی اپنے احساسات اور جذبات بیان کیے ہیں۔ جس سے ان کا اشتراکی نقطۂ نظر واضح صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساجدہ جب تاجی کے کمرے میں جاتی ہے تو بے ساختہ کہتی ہے:

''ویران کوٹھری میں کچے کچے خون کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ طاق میں رکھی ہوئی لالٹین ابھی ٹمٹما رہی تھی۔ اس نے تاجی کا میلا سا تکیہ اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ وہ جو مدتوں سے ایک ایک آنسوؤں کو ترس رہی تھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تاجی، ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ایسی کوٹھریوں سے کچے خون کی بو نہیں آئے گی۔'' (زمین، خدیجہ مستور، ص ۱۱۰)

خدیجہ مستور کے دونوں ناولوں میں ان کی ترقی پسندیت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے سماجی زندگی کے مسائل کی اچھی اور بہترین عکاسی کی ہے۔ وہ ناولوں کی بنیاد مادی حقائق اور سماجی شعور پر قائم کرتی ہیں۔ انھوں نے براہ راست زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں غور وفکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ ان کو افراد کے سماجی تناظر میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی خدیجہ مستور کی ناول نویسی کے بارے میں اپنے مضمون ''آنگن پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں:

''یہ اردو کی دوسری ناول (پہلی امراؤ جان ادا) ہے جس کو میں نے دوسری بار پڑھا اور بار بار پڑھا اور پہلی بار سے زیادہ لطف اندوز ہوا۔ بات یہ ہے کہ یہ ناول ان میں سے ہے جو فن کے صحیح مقام پر پہنچ گئی ہے اور اس لیے اس میں فن کا وہ جادو ہے جو سر چڑھ جاتا ہے اور کبھی نہیں اترتا۔ نہایت سادگی، بے ساختگی نہایت سیدھے طریقے اور پورے فن کارانہ خلوص کے ساتھ یہ ناول نگاری کے اس صراط مستقیم پر چلی جاتی ہے، جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ اور جس پر چلتے چلتے ہمارے پرانے ناول نگار اخلاق اور نظریات کے جہنم میں کٹ کر گر جانے سے نہ بچ سکے۔ واقعیت کی وہ سیدھی راہ جو خلاق زوگی کی بنا پر رسوا کو بھی نہ مل سکی اور جدید نفسیاتی تحلیل کی فکر میں عصمت چغتائی کے ہاتھ سے اور جدید فنی تجربے کے ماتحت قرۃ العین کے ہاتھ سے نکل گئی خدیجہ مستور کے سامنے صاف ہے وہ اس پر نہایت اطمینان سے چلتی نظر آتی ہیں۔ نہایت معمولی نقوش کو نہایت نزاکت کے ساتھ میں وہ عین آسٹن کے شانہ بہ شانہ چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔''

اردو کی ترقی پسند ناول نگار خدیجہ مستور نے اپنے منفرد انداز سے اس عہد کے دیگر ناول نگاروں میں اپنے لیے راستہ بنایا ہے بظاہر ان کے ناول سیدھے سادے اور سپاٹ دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ رمزیت سے پر ہیں۔ خدیجہ مستور کو اگرچہ شہرت ان کے ناول ''آنگن'' کی وجہ سے ملی ہے لیکن ''زمین'' بھی اپنے اسلوب طرز نگارش، مکالمہ نگاری، اور جزیات نگاری کے حوالے سے بھرپور ہے۔ انھوں نے کہانی کی بنت اور کرداروں کو مخصوص پس منظر میں ابھارنے کے لیے جہاں فن کے دیگر لوازم سے کام لیا، وہاں زبان واسلوب کا بھی خاص خیال رکھا۔

خدیجہ مستور کی سادگی میں پرکاری ہے۔ انھوں نے دیگر ناول نگاروں کی طرح اپنے کرداروں کو پیش کرنے کے لیے مبالغے سے کام نہیں لیا بلکہ حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہانی کے مناظر، مکالمے اور کرداروں کے عمل کے لیے ایسا اسلوب اختیار کیا۔ جس میں قاری بھی خدیجہ مستور کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ خدیجہ مستور کے دونوں ناول ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں خدیجہ مستور بحیثیت ناول نگار ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ان کے ناول اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

■■■

رضوانہ

مشترکہ وراثت اور جمہوری زبان

اردو زبان رنگ ونسل، مزاج واحتیاج اور دل میں اُتر جانے والے اپنے استعاروں اور کانوں میں شہد گھولنے والی اپنی شیرینی کے باوصف آج بھی تر وتازہ، شگفتہ اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ اردو ہماری اور ہمارے ملک کی مشترکہ وراثتوں کی نہ صرف امین ہے بلکہ اپنے جمہوری طرز ادا، انداز بیان اور دلوں میں تحرک وتموج پیدا کرنے کی وجہ سے عالمی سطح پر اپنی موجودگی کا ایسا احساس دلا رہی ہے کہ عالم کاری کے اس دور میں اردو سے نابلد افراد بھی اس کی چاشنی اور مٹھاس کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔

بحمد اللہ ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہندوستان میں اردو کی صورت حال جیسی بھی ہو تخن فہمی برقرار ہے۔ یہاں بازاروں سے لے کر ایوانوں تک اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ہندی اور انگریزی کے الفاظ اور جملے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک ہم خود کو ہر قسم کے تعصب سے پرے رکھ کر اردو کی سماجی، لسانی اور تہذیبی صورت حال کا از سر نو جائزہ نہیں لیتے اس وقت تک زبان کے ساتھ انصاف ناممکن ہے اور مشترکہ تہذیبی ورثہ کا احیا بھی ممکن نہیں۔ زبانیں انسان کی امتیازی صفات کے ساتھ ساتھ سماجی اور تہذیبی عناصر کی مظہر بھی ہوتی ہیں۔ اس سے ماورا ہو کر ہم زبان کے تعلق سے سماجی تشکیل اور اس کی معنویت کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ زبان ہمارے سماجی، تہذیبی، فکری اور تعلیمی رشتوں سے ہی پہچانی جاتی ہے اور یہی وہ زمین ہے جسے اساس قرار دیتے ہوئے زبان کی قدر وقیمت کا تعین کرتے ہیں۔ پس اردو زبان وادب کی جڑوں کا ہندوستان کی فضا، فکر اور مزاج سے استوار ہونا ایک لازمی امر ہے۔

شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور پھر دہلی میں ان کی حکومت 1193 کے بعد ہندوستان کے مقامی باشندوں اور نو وارد مسلمانوں کے باہمی اختلاط اور میل جول سے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ جو مختلف ادوار میں ہندوی، ریختہ، دکنی اور پھر اردو کے نام سے مشہور ہوئی۔ چونکہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی زبان ترکی، فارسی اور عربی تھی۔ آریوں نے سنسکرت کو سرکاری زبان کی حیثیت دے رکھی تھی لیکن وہ عام بول چال کی زبان کا مقام حاصل نہ کر سکی۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ وہ اسے پسند بھی نہیں کرتے تھے، لیکن مسلمانوں کا مسئلہ اس کے برعکس تھا۔ انھوں نے آتے ہی اپنی ترکی، فارسی، عربی زبانوں پر ہندوستانی رنگ کا اثر قبول کرنا شروع کر دیا۔ جس سے ایک نئی تہذیب پروان چڑھنے لگی۔ اب چونکہ زبانوں کا تعلق انسانوں کے تہذیبی، تمدنی، معاشرتی ارتقا سے براہ راست ہوتا ہے اور اسی تعلق کے باعث زبانیں غیر ارادی طور پر پیدا ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ سماجی ضرورت کے تحت پروان چڑھتی ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی منشور کے اصول وضوابط عالمی سطح پر مبنی ہیں اس وجہ سے ان میں قومی اتحاد واشتراک کی گنجائش بہت ہے۔ لہٰذا ہندوستان کی مقامی قوموں کے اشتراک اور باہمی ارتباط نیز ہندوستان کی مختلف بولیوں کے آپسی اختلاط وامتزاج نے زبان اردو کو جنم دیا، اس سے متعلق ڈاکٹر تاراچند رقم طراز ہیں:

”یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک ہم خود کو ہر قسم کے تعصب سے پرے رکھ کر اردو کی سماجی، لسانی اور تہذیبی صورت حال کا از سر نو جائزہ نہیں لیتے اس وقت تک زبان کے ساتھ انصاف نا ممکن ہے اور مشترکہ تہذیبی ورثہ کا احیا بھی ممکن نہیں۔“

”مسلم ذہن ہندوانہ رنگ وروپ قبول کرنے لگا اور اس نے فارسی وترکی کی جگہ مقامی زبانوں کو سیکھا اور استعمال کرنا شروع کیا۔ ہندوؤں نے عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کو مقامی محاوروں میں جگہ دی۔ اس لین دین کا منافع ہماری تہذیب کے خزانے میں اردو کی شکل میں شامل ہوا۔“

(ہندوستانی کلچر کا ارتقا، تاریخ کے آئینے میں، ڈاکٹر تارا چند، اگست 1967، ص:48)

ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک اور نئی تہذیبی معاشرتی ضرورتوں کے تحت سب سے زیادہ ترقی کرنے والی زبان اردو تھی۔ تقسیم ہند 1947 کو تاریخ کا ایک ایسا سانحہ پیش آیا جس نے ملک کے ہر چھوٹے بڑے طبقے کو سیاسی، سماجی، معاشرتی، مذہبی، ادبی اور لسانی سطح پر بری طرح سے متاثر کیا۔ انگریزوں کی پیدا کردہ منافرت نے مذہبی فرقہ پرستی کی بنیاد پر ملک کے ٹکڑے کرنے کے علاوہ صدیوں پرانی تہذیب و تمدن کو پارہ پارہ کر دیا۔ قیام پاکستان کے بعد اردو زبان کے ساتھ لسانی سطح پر بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کی ایک وجہ مسلمانوں کی حالت زار تھی دوسرے برطانوی حکومت کی شہہ نے ہندوؤں میں یہ خیال اور قوی کر دیا کہ ہندی بھی دفتری و عدالتی زبان ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد لوگوں میں اردو زبان کے خلاف مخالفت کا جذبہ شدید ہوتا گیا اور یہی وجہ ہے کہ سیاست دانوں نے ہندی کو مرکزی زبان کا درجہ دے کر اردو کا دائرہ تنگ کرنے کے لیے نفسیاتی طور پر دباؤ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی بلکہ اردو طبقہ کے لیے معاشی صورت حال ایک بڑا مسئلہ بن کر کھڑی ہو گئی اور یہی نہیں بلکہ مردم شماری میں اردو والوں کی تعداد حتی الامکان گھٹا کر دکھائی جانے لگی، لیکن وہ پژمردگی جو آزادی کے فوراً بعد اردو والوں پر طاری تھی دھیرے دھیرے اس کی کثافت دور ہوتی گئی لہٰذا اردو کی بازیابی کے لیے انفرادی و اجتماعی طور پر کوششیں شروع ہوئیں۔

اس سلسلے میں جو اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں وہ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے علاوہ اردو کی بقا و ترقی کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہیں جس کا عملی ثبوت "انجمن ترقی اردو" اور "قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان" ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو مرکزی حکومت کے تحت اردو کی ترقی کے لیے کام کرنے والا ادارہ ہے جبکہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے منظم ہو کر مختلف کمیٹیاں اور ادارے قائم کر کے اردو کی ترویج کے لیے راہیں ہموار کیں۔

اس وقت ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے تقسیم کا الزام اردو کے سر لگایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تقسیم کا عمل اردو کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا مگر یہ تقسیم ہند کا ایک بے بنیاد، تعصبانہ، سطحی اور یک رُخا مطالعہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ برطانوی تسلط کی ابتدا سے ہی اردو نے ان کے خلاف جس باغیانہ رویہ کو اختیار کیا اس کی مثال دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔ لسانیات کے تعلق سے نہ صرف اردو پر یہ الزام بے بنیاد ہو کر رہ جاتا ہے، بلکہ اردو کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

ادب چونکہ اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور شاعری جو کہ اس کا جزو لازم ہے اور کسی بھی انقلاب کو سامنے لانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس نے غیر ملکی حکمرانوں سے نجات دلانے کے لیے احساس غلامی سے نجات دلائی۔ قومی و وطنی شعور کو بیدار کیا اور حصول آزادی کے لیے ہر طرح کے خطرات، ظلم و تشدد کے خلاف نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیا۔ اردو نے جنگ آزادی کے دوران انقلاب زندہ باد، ہم آزادی لے کر رہیں گے۔ جیسے پر اثر نعرے دیے، سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا جیسا ترانہ پیش کیا۔ اپنی پر جوش نظموں اور غزلوں سے مجاہدین آزادی کا لہو گرمایا، وہی اردو زبان آج اپنے ملک میں اجنبی ہو گئی۔ جبکہ اردو ہی وہ زبان ہے جسے حب الوطنی اور تحریک آزادی کا مظہر کہا جا سکتا ہے۔ جس نے کسی نہ کسی زاویے سے اجتماعی زندگی کو متاثر کیا۔ معین الدین عقیل کے مطابق:

> "مسلسل سیاسی انتشارات کے نتیجے میں جب قومی تحریکیں وجود میں آئیں تو اردو نے نہ صرف تحریکوں کی جدوجہد کو بیان کیا بلکہ ان میں عملاً حصہ بھی لیا۔"

"اس سلسلے میں جو اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں وہ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے علاوہ اردو کی بقاو ترقی کے لیے همه وقت کوشاں رهیں جس کا عملی ثبوت "انجمن ترقی اردو" اور "قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان" هے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو مرکزی حکومت کے تحت اردو کی ترقی کے لیے کام کرنے والا ادارہ هے جبکه انجمن ترقی اردو (هند) نے منظم هوکر مختلف کمیٹیاں اور ادارے قائم کرکے اردو کی ترویج کے لیے راهیں هموار کیں"

(تحریک آزادی اردو کا حصہ، معین الدین عقیل، پاکستان کراچی 1976، ص:111)

یہ زبان اپنی فطرت کے مطابق مخلوط سماج کا حصہ ہے۔ اس کا سیکولر کردار ہی سب سے نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔ وہ مشترکہ زبان جو حصول آزادی کے لیے چلائی گئی تمام تحریکوں کا محور رہی، افسوس کہ کچھ متعصب اشخاص کی وجہ سے آزادی کے فوراً بعد ہی اسے غیر ملکی زبان کے نام سے پکارا گیا اور جو وجوہ اس کے غیر ملکی ہونے کے بتائے گئے یا جو معیار قائم کیا گیا وہ اس قدر بھونڈا اور پھسپھسا ہے کہ اگر ان کا بغور

مطالعہ کیا جائے تو ہندوستان کی موجودہ کسی بھی زبان کو ہندوستانی ہونے کا حق حاصل نہیں۔

آزادی کے معاً بعد یعنی 1947 میں ہی آفیشل لینگویج ایکٹ پاس کر کے مرکز اور یوپی دونوں جگہ ہندی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ جبکہ اردو کو اس کی خدمات کے صلے میں دوسری سرکاری زبان تک بننے سے محروم رکھا گیا۔ اردو زبان سے متعلق آج بھی لوگوں میں یہ غلط فہمیاں رائج ہیں کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ مسلمانوں سے وابستگی کے سبب یہ زبان ہندو اکثریت کی ناراضگی کا شکار ہوگئی۔ یعنی آزادی سے پہلے اردو تمام قوموں کی خاص طور سے مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کی مشترکہ زبان تھی لیکن آزادی کے بعد سکھوں اور ہندوؤں نے اردو کو اپنے دائرۂ عمل سے خارج کر دیا۔ لہٰذا اپنے شاندار ماضی کو کھونے کے بعد اردو صرف ''مسلمانوں کی زبان'' بن کر رہ گئی۔

ادب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح مسلمانوں کا تہذیبی، ثقافتی، تمدنی اور مذہبی ورثہ اردو ادب میں موجود ہے عین اسی طرح غیر مسلم بالخصوص ہندو دھرم سے متعلق کثیر مذہبی سرمایہ بھی اردو ادب میں محفوظ ہے۔ مثلاً بھگوت گیتا، پران، رامائن، بدھ ازم، جین ازم وغیرہ سے متعلق معلومات یا تراجم! بھگوت گیتا کے تقریباً 82 مطبوعہ ایڈیشن اور پرانوں کے 45 نسخے اردو زبان میں دستیاب ہیں۔ اردو زبان کسی ایک مذہب، قوم کی نہیں بلکہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی قوموں کی یکساں طور پر محبوب ترین زبان رہی ہے، یہی وجہ تھی کہ ہر مذہب کے ماننے والوں نے اپنے دینی امور کی تبلیغ و ترسیل کے لیے اس زبان کا سہارا لیا ہے۔

یہی وہ وجہ ہے کہ ہندی کے مرکزی زبان ہو جانے پر جب اسے تمام صوبوں پر مسلط کیا جانے لگا تو جنوبی ہند میں اس کا شدید ردعمل سامنے آیا جس کے نتیجے میں وہاں ہندی بولنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب کہ شمالی ہند میں جہاں اردو دو سو برسوں سے ایک تہذیبی پس منظر میں چھائی ہوئی تھی اس کے ساتھ بے گانوں سا سلوک کیا گیا۔

ہندوستان میں اردو کے مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ اردو ذریعۂ تعلیم کا محدود ہونا ہے۔ کیونکہ کسی بھی زبان کی بقا و تحفظ اور ترقی کا انحصار ''تعلیم یعنی (Education) پر ہوتا ہے۔ اور یہ تعلیم مادری زبان میں ہی ممکن ہے۔ تعلیم محض چند علوم و فنون کو سیکھ کر معلومات کا ذخیرہ جمع کر لینے کا نام نہیں بلکہ یہ بچے کی صحیح ذہنی نشوونما اور اس کی صلاحیتوں کے بالفعل اظہار و تکمیل کا نام ہے۔ اس مقصد کے بغیر تعلیم ادھوری ہے۔ اس صورت حال سے نپٹنے کا واحد ذریعہ مادری زبان میں تدریس ہے۔

ہندوستان کے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جانی چاہئے۔ (دستور کی دفعہ A530) اور حکومت کی پالیسی کے مطابق۔ سہ لسانی فارمولے کو پانچویں کلاس اور اس سے اگلی کلاس پر لاگو کرنا چاہئے۔ تاکہ مادری زبان کو ابتدا ہی سے لازمی زبان کے طور پر پڑھایا جائے۔ شمالی ہند کی کئی ریاستوں میں پہلی کلاس سے ہندی کو اول زبان کا درجہ دے کر پڑھایا جاتا ہے۔ یہ سہ لسانی فارمولے کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ اس طریق کار سے ہندی کو ان غیر ہندی والوں پر تھوپا گیا ہے۔ جن کی مادری زبان اردو ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ سیکولر تعلیم میں اردو کو جگہ دینے سے مسلسل احتراز اور انکار کیا جاتا جا رہا ہے۔ اور افسوس اس امر پر بھی ہے کہ یہ سب خود کو سیکولر کہنے والی سیاسی جماعتیں کرتی رہی ہیں۔

وہ طلبا جن کی مادری زبان اردو یا دوسری کوئی اقلیتی زبان ہے اس کی بقا کی کیا گنجائش ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو کو دستور میں دیے گئے تحفظ کے باوجود قومی دھارے اور سیکولر تعلیمی نصاب سے منظم طور پر خارج کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اردو کی بقا و تحفظ کے لیے ایک ایسا فارمولہ تجویز کیا جائے جس سے اردو کو اسکول کی تعلیم میں لازمی طور پر شامل کیا جاسکے۔ ہندوستان کا دستور یقین دلاتا ہے کہ یہ ایک سیکولر ملک ہے۔

اردو کی مزید ترقی اور فروغ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایسی لسانی دستاویزات جو کہ عام لوگوں سے متعلق ہیں جیسے سرکاری نوٹس، ووٹر لسٹ، راشن کارڈ وغیرہ دونوں زبانوں میں ہونا چاہئے۔ نیز عدالتوں میں ہر قسم کی دستاویزات اردو زبان میں بھی داخل کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ تمام سرکاری و غیر سرکاری کاموں کے لئے درخواستیں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی قبول کی جانی چاہئیں۔ تمام سرکاری اعلانات، اطلاعات، نوٹسز اور گزٹ کی اشاعت ہندی کے علاوہ اردو میں بھی ہونی چاہئے۔ ابتدائی اور مڈل سطح پر اردو کی تعلیم کا معقول انتظام ہونا چاہئے۔ یہی نہیں بلکہ اردو داں طبقہ کے لئے اسی تناسب سے روزگار اور سرکاری سروسز میں جگہ کی فراہمی بھی ضروری امر ہے۔ اردو کو سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر جن تلخ حقیقتوں سے سامنا ہے وہ تو ہے ہی دستور میں دیے گئے حقوق کو ہر سطح پر نیک نیتی سے نافذ کرنے اور عملی جامہ پہنانے کی بھی ضرورت ہے۔

○○

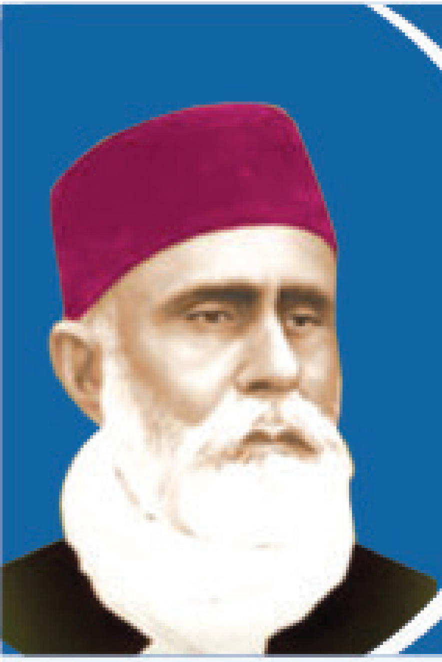

ڈاکٹر سیما صغیر

تعلیم نسواں کا نقیب
الطاف حسین حالی

انیسویں صدی کے ہندوستانی بالخصوص مسلم معاشرے میں جو تبدیلی آرہی تھی اس میں رفقائے سرسید کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی جانب بھی توجہ دی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اصلاح معاشرت کی کوئی بھی کوشش تعلیم نسواں کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی ہے۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ افراد میں ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور نواب سلطان جہاں بیگم نے کوشش کی کہ خواتین بدلے ہوئے نظام کے تقاضوں کے تحت نئے تصورات سے واقف ہوں۔ طبقۂ نسواں میں تعلیم کی بیداری کے لیے ان جلیل القدر شخصیات نے ادب کی دونوں اصناف نثر ونظم سے مفید کام لیا۔

رفقائے سرسید نے مسائل تہذیب وتمدن اور زبان وادب کی طرح خواتین کے مسائل بھی اپنی تحریروں کے ذریعے قارئین کے سامنے رکھے۔ اس کے لیے انھوں نے محض ہمدردانہ رویہ اختیار نہیں کیا بلکہ ان کی زبوں حالی کو دور کرنے کے امکانی جتن بھی کیے۔ نذیر احمد نے پہلی بار سماجی مسائل کو موضوع بناتے ہوئے خواتین کی کسمپرسی کو فوقیت دی اور انھیں جدید علم وہنر سے مالا مال کرنے کی کوشش کی۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے نہ صرف تحریر وتقریر کے ذریعے خواتین کے سماجی وقار ومرتبہ اور تعلیم وتربیت کی طرف توجہ مبذول کی بلکہ عملی اقدام بھی کیے۔ شبلی نعمانی جو سلطان جہاں بیگم سے بھی بے حد متاثر تھے، انھوں نے تعلیم نسواں کو فروغ دینے میں تعاون کیا۔

ان سبھی نے افسانوی اور غیر افسانوی نثر دونوں کو اظہار کا وسیلہ بنایا۔ بیان اور انداز بیان سبھی کا تقریباً ایک سا یعنی ناصحانہ اور اصلاحی رہا۔ یہاں محض حالی کا ذکر مقصود ہے جنھوں نے جدید تعلیم اور تربیت پر دسترس کے لیے پہلی بار خواتین کا انتخاب کیا اور روشن خیالی کے فروغ کے لیے نثر میں ''مجالس النساء'' خلق کی تو ان کی شاعری میں ''مناجات بیوہ''، ''چپ کی داد'' اور ''بیٹیوں کی نسبت'' جیسے فن پارے تعلیم نسواں کے محرک ہیں۔ انھوں نے یہ تخلیقات اپنے، یا اپنے اہل وعیال کی ضرورت کے پیش نظر خلق نہیں کیں بلکہ ان کا مقصد قوم کی بچیوں اور عورتوں کو تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنا تھا۔ صالحہ عابد حسین ''مجالس النساء'' کے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

> ''حالی کے دل میں عورتوں کا بڑا احترام تھا اور ان کی تعلیم، تربیت اور بھلائی کی گہری فکر تھی۔ اور اس کا بڑا دکھ تھا کہ عورت کو مردوں نے علم کی روشنی سے محروم رکھا ہے۔ اس احساس کی پہلی جھلک 'مجالس النساء' میں نظر آتی ہے۔ بعد میں یہی درد ''چپ کی داد'' میں ڈھل کر سامنے آیا۔ حالی کی کوششیں صرف قلم تک محدود نہ رہیں۔ انھوں نے اپنے خاندان، محلے اور اپنے وطن پانی پت میں لڑکیوں کی تعلیم کو رواج دیا۔''

فروغ تعلیم نسواں کا یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سمیع اختر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا حالی کی اجتماعی شاعری کا ایک اہم عنصر ہندوستانی معاشرے میں از روئے انسانیت اور از روئے شریعت عورتوں کے جائز دینی، انسانی اور معاشرتی حقوق کی بازیابی کے لیے عملی جدوجہد ہے۔ مولانا حالی ہندوستانی معاشرے میں عورتوں پر ہونے والے مظالم اور زیادتیوں سے بے حد رنجیدہ اور کبیدہ خاطر تھے۔ ان کا یہ درد ان کی نظم ''چپ کی داد''، ''مناجات بیوہ'' اور ''بیٹیوں کی نسبت'' میں پوری طرح نمایاں نظر آتا ہے۔''

(تہذیب الاخلاق، حالی نمبر 2014، ص: 36)

ان تینوں نظموں میں حالی نے ہمارے معاشرے میں رائج تباہ کن رسوم کے توسط سے خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو نہایت موثر انداز میں اُجاگر کیا ہے۔ مثلاً اس عہد میں والدین کے لیے شادی کا مرحلہ بھی کسی بڑے مرحلے سے کم نہیں تھا۔ تا ؤ آج بھی ختم نہیں ہوا ہے مگر انیسویں صدی کے مسلم معاشرے میں مہذب سسرال اور با کردار شوہر کے انتخاب کو حالی نے "بیٹیوں کی نسبت" میں خوبی سے پیش کیا ہے۔ وہ نظم کا اختتام ان اشعار پر کرتے ہیں:

جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وہاں
گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر
ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی
زندہ درگور صدا رہتے ہیں اور خستہ جگر
اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

مختلف تاویلوں سے یہ باور کرایا ہے کہ جب قوم کی اصلاح اور نئی نسل کی تربیت کا انحصار خواتین پر ہے تو پھر ان کے ساتھ ظلم اور زیادتی کیوں؟ سنت نبوی پر عمل کرنے والی قوم حضرت خدیجہ سے سبق لینے کے بجائے 'بیوہ' کو مسائل و مصائب میں مبتلا کیوں کرتی ہے؟ "مناجات بیوہ" میں حالی نے حمد یہ طرز کا سہارا لے کر کم سن بیوہ کی درد بھری کہانی کو بیان کیا ہے اور وہ بھی خود اس کی زبانی۔ ابتداءً اللہ کی بزرگی اور عظمت کو پیش کیا گیا ہے پھر بدلتے ہوئے زمانے کے نشیب و فراز کے ساتھ بیوہ کا دل گداز قصہ ہے۔

جس دکھیا پہ پڑے یہ بپتا
کر اُسے تو پیچ نہ زمیں کا
یا عورت کو پہلے بلا لے
یا دونوں کو ساتھ اٹھا لے
یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی
جس سے گئی ہے پریت یہاں کی
قوم سے تو یہ ریت چھڑا دے
بندیوں کی بیڑی یہ ترا دے
رنج اور دکھ قبضے میں ہے تیرے
چین اور سکھ قبضے میں ہے تیرے

مالک رام اپنے مضمون "حالی اور ہندوستانی ادب کے معمار" میں اس نظم پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انھوں نے کمسن بیوہ کے دکھوں کو محسوس کر کے دل نشیں اور شیریں الفاظ میں 'مناجات بیوہ' لکھی۔ وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے عورتوں کی مظلومیت کے خلاف آواز اٹھائی اور سماج کو یقین دلایا ہے۔ اس نظم میں کمسن بیوہ کی دردناک داستان جس نے اپنے شوہر کو کھو دیا تھا، بیان کی گئی ہے۔ یہ بیوہ سماج کے ایسے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھی کہ اس کا باہر نکلنا ناممکن تھا۔ حالی نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہے۔" (ص: 42)

اس موثر نظم کا انداز تخاطب سادہ، صاف ستھرا مگر ذہن کو جھنجھوڑ دینے والا ہے۔ زبان اس طبقے کی روز مرہ کی زبان ہے جس میں ایک بدقسمت عورت اپنی بپتا سنا رہی ہے۔

"چپ کی داد" میں عورت کی مکمل شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے اس کی فطری صفات کا ذکر کیا ہے۔ اس کی محبت و مروت، شرم و حیا، صبر و رضا کی تعریف کرتے ہوئے، قدر و منزلت اور بلندئ درجات کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ مذکورہ نظم میں معاشرے کے سامنے آئینہ رکھتے ہوئے حالی سوال قائم کرتے ہیں کہ جب دنیا کی زینت اور قوموں کی عزت خاتون خانہ سے ہے تو پھر اس پر جور و جفا کیوں؟ علم و ہنر کے دروازے اس پر مختصر اور محدود کیوں کر دیے گئے۔

جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات
ٹھہرا تمھارے حق میں وہ زہر ہلاہل سر بسر

نتیجتاً

علم و ہنر سے رفتہ رفتہ ہو گئیں مایوس تم
سمجھا لیا دل کو کہ ہم خود علم کے قابل نہ تھیں

سمجھانے بجھانے کا کام معاشرے نے اس طرح کیا کہ

جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر، ویسی ہی جاؤ بے خبر

حالی نے انتہائی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے وہ بات کہہ دی جو ان سے پہلے شاید ہی کسی نے اس قدر بیباکی سے کہی ہو

دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادہ علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پا کر آدمی بننا تمھیں زیبا نہیں

''چپ کی داد'' کا طریقہ حالی نے انوکھا نکالا

آخر تمھاری چپ دلوں میں اہل دل کے چبھ گئی
سچ ہے کہ چپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں

نظم کے آخر میں وہ قاری کو مژدہ سناتے ہیں

جو حق کے جانب دار ہیں بس ان کے بیڑے پار ہیں
بھوپال کی جانب سے یہ ہاتف کی آواز آئی ہے
ہے جو مہم در پیش، دست غیب ہے اس میں نہاں
تائید حق کا ہے نشاں امداد سلطانِ جہاں

حالی نے بیداریٔ نسواں کی جو شمع 1884 میں ''مناجات بیوہ'' کی شکل میں روشن کی تھی یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اسی سال دہلی سے عورتوں کی تعلیم وتربیت کے پیش نظر ''اخبار النساء'' جاری ہوا۔ دو سال بعد ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسے میں شعبۂ تعلیم نسواں کا قیام عمل میں آیا اور مولوی ممتاز علی اس کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے۔ 1902 میں جب شیخ محمد عبد اللہ کانفرنس کے سکریٹری بنائے گئے تو حالی نے بے حد مسرت کا اظہار کیا۔ حالی کے مشورہ سے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے رسالہ ''علی گڑھ منتھلی'' نومبر 1903 کا شمارہ ''ہم اور ہماری خواتین'' کے لیے مخصوص کیا گیا۔ ''تہذیب نسواں'' اور رسالہ ''خاتون'' کے محرک بھی الطاف حسین حالی ہیں۔ اس کا اعتراف مولوی ممتاز علی اور شیخ محمد عبد اللہ دونوں نے کیا ہے۔ 1905 میں شائع ہونے والی ان کی یہ نظم ''چپ کی داد'' رسالہ ''خاتون'' میں ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔ خصوصی توجہ اس جانب چاہتی ہوں کہ مذکورہ نظم کے اختتام میں نواب سلطان جہاں بیگم کا جو دانستہ ذکر آیا ہے وہ اسی لیے کہ بیگم سلطان جہاں اس عہد میں تحریک نسواں کی سب سے بڑی سرپرست تھیں۔

نثر میں حالی نے تعلیم نسواں کے موضوع کو ''مجالس النساء'' کے توسط سے پیش کیا ہے۔ یہ شاہکار تخلیق حالی نے مدرسۃ العلوم کے قائم ہونے سے ایک سال قبل لاہور کے قیام کے دوران لکھی تھی۔ اس کتاب میں پیش کیے گئے خواتین کی تعلیم وتربیت اور بچوں کی نگہداشت و پرورش کے مثبت اور تعمیری انداز فکر کو بہت سراہا گیا۔ ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیم نے اسے نصاب میں شامل کیا۔ گورنر جنرل نے چار سو روپے کا انعام دیا۔ یہ کتاب نہ صرف مشرقی تہذیب وتمدن کی غماز ہوئی بلکہ مغربی افکار و نظریات کے اثرات کا عکس پیش کرنے میں بھی معاون ہوئی۔ ''مجالس النساء'' میں پست ہمتی کے بجائے حوصلہ مندی اور منافرت کے بجائے مصالحت کو اختیار کرنے کی تلقین ملتی ہے۔ حالی کی اس تصنیف نے واضح کر دیا کہ آنے والا زمانہ جدید علوم وفنون کا ہے اور اس کے فروغ میں نصف آبادی سے گریز ممکن نہیں ہے۔

اپنے وقت کے اس نصیحت نامہ میں ہر عہد میں ترقی کا تصور پوشیدہ ہے۔ اسی لیے حالی کی یہ نثری تصنیف عصر حاضر کے قاری کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہتی ہے۔ دو حصوں پر مشتمل ''مجالس النساء'' کے نو (9) ابواب ہیں جنھیں مجالس کا نام دیا گیا ہے۔ ایک حصہ ماں اور بیٹی کے گرد گھومتا ہے تو دوسرے حصے میں بیٹے اور ماں کی کشمکش ہے۔ مرکزی کردار زبیدہ ہے جسے اس کے والد خواجہ فضیل نے علم و ہنر سے آراستہ کیا ہے۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر امجد علی اور بیٹے سید عباس کی ذمہ داری نبھاتی ہے۔ تین سال کی عمر میں ہی سید عباس سایۂ پدری سے محروم ہو جاتا ہے اور بیوہ زبیدہ اپنے بیٹے کو معاشرے کے سامنے ایک صحت مند، روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ حالی نے یہ واضح کیا ہے کہ یہ تربیت اسے اپنے روشن خیال والدین سے ملی ہے جس کی دور حاضر میں اشد ضرورت ہے۔

ابتدائی چار مجلسوں میں یہ نکتہ اجاگر کیا گیا ہے کہ ماں اگر ذی شعور، سلیقہ مند اور صاحب علم ہو تو وہ بچوں میں علم کا ذوق وشوق بھر دیتی ہے، عقل وشعور سے کام لینے کا ہنر سکھا دیتی ہے اور اس عمل کے لیے کوئی روایتی طریقۂ کار استعمال کرنا ضروری نہیں بس وقت کی نزاکت کو سمجھنا لازم ہے۔ بقیہ چار مجلسوں میں لڑکے اور لڑکی کی تخصیص وتمیز کو ختم کرتے ہوئے علم و ہنر کے فوائد کو اس طرح بیان کیا ہے کہ نئے خیالات کو قبول کیے بغیر ترقی کی راہوں پر بآسانی آگے بڑھنا آسان نہیں ہوگا۔

زبیدہ بیگم کے علاوہ مذکورہ ادب پارے میں پانچ اور متحرک کردار، محمودہ بیگم، آتو جی (استانی)، مریم زمانی، سید امجد علی اور سید عباس کے ہیں۔ پہلی مجلس میں آتو جی کے ساتھ محمودہ بیگم اور اس کی ماں مریم زمانی کی حالات حاضرہ پر گفتگو ہے۔ دوسری مجلس میں توہمات، عقائد اور رسم و رواج پر آتو جی کا بیان ہے۔ تیسری، چوتھی اور پانچویں مجلس میں زبیدہ خاتون اور ان کے بیٹے سید عباس کے حصول علم اور نظام تعلیم پر مدلل جوابات ہیں۔ چھٹی مجلس میں آتو جی، مریم زمانی اور بڑی بیگم کا ملا جلا رد عمل ہے۔ اس حصے میں سید امجد علی کا وصیت نامہ خاصہ اہم ہے کیونکہ تینوں مجلسیں وصیت نامے کے عمل اور رد عمل سے براہ راست وابستہ ہیں۔

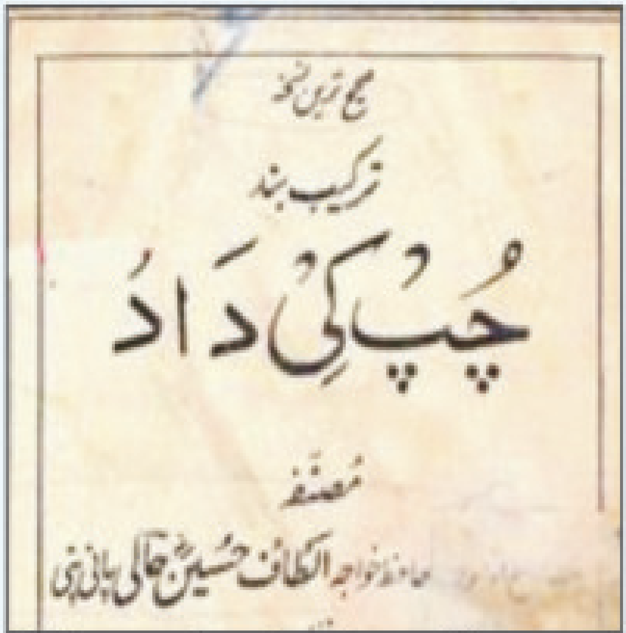

قصہ میں رائج بیانیہ سے الگ ہٹ کر مکالماتی انداز میں خواتین کی جو محفل سجائی گئی ہے اس میں بے تکلف گفتگو کا واضح انداز ہے۔ منظر اور پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے سوال وجواب کے توسط سے ایک باقاعدہ پلاٹ ترتیب دیا گیا ہے اور ہر حصے میں اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ یہ بات قاری کے ذہن نشین ہوتی جائے کہ ماں پر بچے کی پرورش، نگہداشت اور تعلیم وتربیت کا دارومدار ہے۔ لہٰذا اس کا ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہونا ضروری ہے۔ یہ تاکید بھی ہے کہ وہ محض شفقت اور محبت کا ہی اظہار نہ کرے بلکہ ایک جراح اور معلّم کے فرائض انجام دیتے ہوئے اس میں سختی برتنے کی بھی صلاحیت ہو۔ مکالمہ کے ذریعہ مباحث کو اٹھانے کی روایت مغرب میں مکالمات افلاطون سے چلی آ رہی ہے۔ مشرق میں بھی صوفیاء کے ملفوظات میں گفتگو اور تمثیل کے وسائل سے تصوف کے نکات بیان کیے گئے ہیں۔ حالی کی یہ کاوش عام زندگی کے گھریلو معاملات کو موضوع بنا کر ان کی اہمیت واضح کرتی ہے۔

خواتین کو بدلتے ہوئے زمانے کا احساس دلانے کے لیے حالی نے سادہ، سلیس، رواں اور دلکش زبان کا استعمال کیا ہے جبکہ ان کے ہم عصر ڈپٹی نذیر احمد اسی موضوع پر دہلی اور نواح دہلی کی ٹکسالی زبان، روزمرہ، محاورے اور کہاوتیں استعمال کرتے ہیں جو آج کچھ اجنبی محسوس ہوتے ہیں مگر یہ اجنبیت حالی کے ہاں نہیں ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> ''میں پانچ برس کی تھی جب اماں جان نے مجھے استانی جی کے سپرد کیا۔ اتنی بات تو مجھے یاد ہے۔ ساتویں برس تک میں ان سے فقط قرآن شریف پڑھتی رہی۔ اس میں پانچ چھ سپارے میں نے یاد کر لی۔ ابھی پڑھنے لکھنے کی کسی نے زیادہ تاکید مجھ پر نہیں کی تھی۔'' (ص۔36)

> ''میرے نزدیک بچے کو علم پڑھانا اور کڑوی دوا پلانی برابر ہے، اسی لیے جب تک وہ علم کے فائدوں کو نہ سمجھے اس کو تعلیم بھی اسی طرح دینی چاہیے جس طرح گھٹی کو تھوڑی تھوڑی کر کے پلاتے ہیں اور جس وقت اس کا جی پڑھنے لکھنے سے گھبرانے لگے تو کھیل کود میں اس کا دل بہلانا چاہیے۔'' (ص:119)

کردار نگاری کے اعتبار سے دیکھیں تو زبیدہ اور عباس کے کردار خاصے متحرک ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ بے جان وصیت نامہ بھی فعال نظر آتا ہے۔ دراصل حالی کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا۔ اسی لیے یہ کردار علم و ہنر کی اہمیت اور افادیت کے لیے نمونے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ نئی نسل کی بلندیوں پر پہنچانے میں ماں کے کردار کو مرکزیت حاصل ہے۔

حالی نے محض ''مجالس النساء'' میں ہی نہیں ''مناجات بیوہ''، ''چپ کی داد'' اور ''بیٹیوں کی نسبت'' کو خلق کرتے ہوئے کڑوی، کسیلی اور پیچیدہ باتوں کو بھی سیدھے سادے انداز میں بیان کیا ہے جو براہ راست دل پر اثر کرتا ہے۔ اصلاحی موضوع کا انتخاب کرنے کے باوجود ان فن پاروں میں جدت پیدا کی ہے۔ واقعات کو اس خوش اسلوبی سے برتا ہے کہ دور حاضر میں بھی ان کی معنویت برقرار ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود حالی کی یہ تخلیقات خصوصاً ''مجالس النساء'' آج بھی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہے۔ عصر حاضر میں ان تصنیفات کی مقبولیت یہ ثبوت مہیا کرتی ہے کہ علی گڑھ تحریک نے تعلیم نسواں پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔

گذشتہ سے پیوستہ

تعزیرات ہند اور خواتین
جنسی و دیگر جرائم

خواجہ عبدالمنتقم

تشریح-1: اس دفعہ کی غرض کے لیے، ''نجی فعل'' میں کسی ایسے مقام میں کیا جانے والا مشاہداتی فعل شامل ہے جس کے بارے میں ایسی صورت حال میں معقولاً یہ توقع کی جائے کہ اس کے لیے خلوت ضروری ہے اور جہاں متاثر شخص کے اعضائے تناسل، پچھلا حصہ یا سینہ کھلا ہوا ہو یا اندر زیب تن لباس میں چھپا ہوا ہو یا متاثر شخص کے ذریعے پیشاب خانہ میں پیشاب کیا جا رہا ہو یا متاثر شخص ایسے جنسی فعل میں مصروف ہو جو عام طور پر سب کے سامنے نہ کیا جا سکے۔

تشریح-2: جہاں متاثر شخص تصویر لینے یا کسی فعل کو (کیمرہ وغیرہ میں) قید کرنے کے لیے رضامندی کا اظہار کر دیتا ہے لیکن کسی تیسرے فریق کو بھیجنے کے لیے منع کرتا ہے اور جہاں ایسی تصویر یا فعل کی ترسیل کی جاتی ہے تو اسے اس دفعہ کے تحت جرم سمجھا جائے گا۔

تعاقب و زدیدہ، خفیہ طور پر پیچھا کرنا (اسے چھیڑنے، ستانے، باہمی تعلق پیدا کرنے کے لیے مجبور کرنے، اس کے انٹرنیٹ، ای میل یا کسی الیکٹرانکی ذریعہ استعمال کی مانیٹرنگ کرنے کی غرض سے)

اسٹاکنگ (Stalking)

دفعہ 354د: (1) کوئی بھی شخص جو—

(i) کسی عورت کا پیچھا کرتا ہے اور اس سے رابطہ قائم کرتا ہے یا اس عورت کی صریح عدم دلچسپی کے باوجود اس سے ذاتی رابطہ قائم کرنے کی بار بار کوشش کرتا ہے؛ یا

(ii) کسی عورت کے انٹرنیٹ، ای میل یا کسی دیگر الیکٹرانکی ذریعہ استعمال کی مانیٹرنگ کرتا ہے، وہ stalking کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔

لیکن اگر وہ اپنے اس عمل کی بابت یہ ثابت کر دیتا ہے کہ—

(i) اس نے ایسا انسداد جرم یا جرم کا پتہ لگانے کے لیے کیا ہے اور یہ کہ اسٹاکنگ کے ملزم شخص کو سرکار نے انسداد جرم اور جرم کا پتہ لگانے کی ذمہ داری سونپی تھی؛ یا

(ii) یہ کہ ایسا کسی قانون کے تحت یا کسی قانون کے تحت کسی شخص کے ذریعہ عائد کی گئی کسی شرط یا مطلوبہ لازمیت کی تعمیل کے لیے کیا گیا تھا؛ یا

(iii) مخصوص حالات میں ایسا کرنا مناسب اور درست تھا۔

(2) جو کوئی اسٹاکنگ کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے اسے پہلی بار اثبات جرم کی صورت میں دونوں میں سے کسی بھی قسم کی کی 3 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا اور دوسری بار یا مابعد اثبات جرم کی صورت میں اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی 5 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔

بھگا لے جانا (Kidnapping)

دفعہ 359: بھگا لے جانے کی دو قسمیں ہیں: بھارت سے بھگا لے جانا، اور ولایت جائز میں سے بھگا لے جانا۔

بھارت سے بھگا لے جانا (Kidnapping from Inda)

دفعہ 360: جو کوئی کسی شخص کو اس کی یا اس شخص کی جانب سے رضامندی دینے کے قانوناً مجاز کسی کی رضامندی کے بغیر، بھارت کی حدود سے باہر لے جائے تو کہا جائے گا کہ اس شخص کو بھارت سے بھگا لے جایا گیا ہے۔

ولایت جائز میں سے بھگا لے جانا

Kidnapping from lawful guardianship

دفعہ 361: جو کوئی 16 برس سے کم عمر کے کسی نابالغ لڑکے کو اور 18 برس سے کم کسی نابالغ لڑکی کو، یا کسی فاترالعقل شخص کو، ایسے نابالغ یا فاترالعقل شخص کے جائز ولی کی تحویل میں سے، ایسے ولی کی رضامندی کے بغیر لے جائے یا بہکا لے جائے تو یہ کہا جائے گا کہ ایسے نابالغ یا فاترالعقل شخص کو ولایت جائز میں سے

بھگالے جایا گیا ہے۔

تشریح:- دفعہ ہذا میں الفاظ "جائز ولی" میں ایسا کوئی بھی شخص شامل ہے جسے ایسے نابالغ یا دیگر شخص کی خبر گیری یا تحویل قانون کی رو سے سونپی گئی ہو۔

استثنیٰ:- دفعہ ہذا کی توسیع کسی ایسے شخص کے فعل پر نہیں ہوتی ہے جو نیک نیتی سے یہ باور کرے کہ وہ ناجائز بچے کا باپ ہے یا جو نیک نیتی سے یہ باور کرے کہ وہ ایسے بچے کو تحویل میں رکھنے کا قانون کی رو سے حقدار ہے، جب تک کہ ایسے فعل کا ارتکاب کسی غیر اخلاقی یا ناجائز مقصد سے نہ کیا جائے۔

اغوا (Abduction)

دفعہ 362: جو کوئی کسی شخص کو کسی جگہ سے چلے جانے پر جبری طور پر مجبور کرے یا فریب کاری سے ایسا کرنے کی ترغیب دے تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے اس شخص کو اغوا کیا ہے۔

بھگالے جانے کی سزا (Punishment for kidnapping)

دفعہ 363: جو کوئی بھارت سے یا ولادیت جائز میں سے کسی شخص کو بھگالے جاتا ہے، اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی 7 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔

بھیک مانگنے کی اغراض سے کسی نابالغ کو بھگالے جانا یا اس کا کوئی عضو بیکار کرنا

Kidnapping or maiming a minor for purposes of begging

دفعہ 363 الف: (1) جو کوئی کسی نابالغ کو بھگالے جائے یا کسی نابالغ کا جائز ولی نہ ہوتے ہوئے اس کی تحویل اس غرض سے حاصل کرے کہ اس نابالغ کو بھیک مانگنے کی غرض سے کام میں لگایا جاسکے یا استعمال کیا جاسکے، تو اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی 10 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(2) جو کوئی کسی نابالغ کا عضو اس غرض سے بیکار کردے کہ ایسے نابالغ کو بھیک مانگنے کی غرض سے کام میں لگایا جائے یا استعمال کیا جائے، اسے سزائے عمر قید دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔

(3) جب کوئی شخص کسی نابالغ کا جائز ولی نہ ہوتے ہوئے اس کو بھیک مانگنے کی غرض سے کام میں لگائے یا استعمال کرے تو یہ قیاس کیا جائے گا، جب تک کہ اس کے برعکس کچھ ثابت نہ ہو، کہ وہ اس نابالغ کو بھگالے گیا ہے یا دیگر طور پر اس نے اس کی تحویل اس غرض سے حاصل کی ہے کہ نابالغ کو بھیک مانگنے کی غرض سے کام میں لایا جائے یا استعمال کیا جائے۔

(4) دفعہ ہذا میں:

(الف) بھیک مانگنے سے مراد ہے۔

(i) کسی جائے عامہ پر خواہ گانے، ناچنے، قسمت کا حال بتانے، کرتب دکھانے یا چیزیں بیچنے کے بہانے سے یا دیگر طور پر بھیک مانگنا یا بھیک لینا؛

(ii) بھیک مانگنے یا لینے کی غرض سے کسی نجی رہائش گاہ میں داخل ہونا؛

(iii) بھیک مانگنے یا جبراً بھیک حاصل کرنے کی غرض سے خود اپنی یا کسی دیگر شخص یا کسی جانور کی کسی ضرب، زخم، چوٹ، معذوری یا مرض کو ظاہر کرنا یا اس کی نمائش کرنا؛

(iv) بھیک مانگنے یا بھیک لینے کی غرض سے کسی نابالغ کو نمائش کے طور پر استعمال کرنا،

(ب) "نابالغ" سے مراد ہے:

(i) کسی مرد کی صورت میں 16 سال سے کم عمر شخص، اور

(ii) کسی عورت کی صورت میں 18 سال سے کم عمر شخص۔

قتل عمد کی غرض سے بھگالے جانا یا اغوا کرنا

Kidnapping or abducting in order to murder

دفعہ 364: جو کوئی کسی شخص کو اس غرض سے بھگالے جائے یا اغوا کرے کہ ایسے شخص کو قتل کیا جائے یا اسے ایسی حالت میں رکھا جائے جس سے کہ اس کو قتل کیے جانے کا اندیشہ ہو، اسے عمر قید یا 10 سال تک کی قید بامشقت کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔

کسی شخص کو خفیہ طور پر اور حبس بے جا میں رکھنے کی نیت سے بھگالے جانا یا اغوا کرنا

Kidnapping or abducting with intent secretly and wrongfully to confine person

دفعہ 365: جو کوئی شخص کسی شخص کو اس نیت سے کہ اس کو خفیہ طور پر اور حبس بے جا میں رکھا جاسکے، بھگا کر لے جائے یا اغوا کرے، دونوں میں سے کسی بھی قسم کی 7 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

کسی عورت کو شادی وغیرہ کے لیے مجبور کرنے کی غرض سے بھگالے جانا،

اغوا کرنا یا ترغیب دینا

Kidnapping, abducting or inducing woman to compel her marriage, etc

دفعہ366: جو کوئی کسی عورت کو بھگا لے جائے یا اغوا کرے اس نیت سے یا اس امر کے امکان کے علم سے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کسی شخص سے شادی کرنے کے لیے مجبور کی جائے یا اس کی یہ غرض ہو کہ وہ جماع ناجائز کے لیے مجبور کی جائے یا پھسلائی جائے یا اس امر کے امکان کا اسے علم ہو کہ وہ جماع ناجائز کے لیے مجبور کی جائے گی یا پھسلائی جائے گی، اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی 10 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا؛ نیز اگر کوئی شخص تخویف مجرمانہ کے ذریعے، جس کی تعریف مجموعہ ہذا میں کی گئی ہے یا اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال میں یا کسی دیگر جبری طریقے سے، کسی عورت کو اس نیت سے اور اس امر کے امکان کے علم سے کہ اس کو کسی غیر شخص سے ناجائز جماع کے لیے مجبور کیا جائے گا یا پھسلایا جائے گا، کسی جگہ سے جانے کی ترغیب دے تو اسے بھی متذکرہ بالا سزا دی جائے گی۔

نابالغ لڑکیوں کی دلالی (Procuration of minor gid)

دفعہ366 الف: جو کوئی شخص 18 سال سے کم عمر کی نابالغ لڑکی کو خواہ کسی بھی طریقے سے کسی جگہ لے جانے یا کوئی فعل کرنے کی ترغیب دے اس نیت سے یا اس امر کے امکان کے علم سے کہ اسے کسی دیگر شخص سے جماع ناجائز کے لیے مجبور کیا جائے گا یا پھسلایا جائے گا، اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی 10 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

بیرون ملک سے لڑکیوں کی درآمد

Importation of girl from foreign country

دفعہ366 ب: جو کوئی 21 برس سے کم عمر کی لڑکی کو بیرون بھارت کسی ملک سے یا ریاست جموں و کشمیر سے اس نیت سے یا اس امر کے امکان کے علم سے کہ اسے کسی دیگر شخص سے جماع ناجائز کے لیے مجبور کیا جائے گا یا پھسلایا جائے گا، اسے 10 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

کسی شخص کو اس غرض سے بھگا لے جانا یا اغوا کرنا کہ اسے ضرر شدید پہنچایا جائے یا غلام وغیرہ بنا کر رکھا جائے

Kidnapping or abducting in order to subject person to grievous hurt,slavery, etc

دفعہ367: جو کوئی کسی شخص کو اس غرض سے بھگا لے جائے یا اغوا کرے یا ایسی حالت میں رکھے جس میں اسے ضرر شدید پہنچے یا وہ غلام بنایا جائے یا کسی شخص کی غیر فطری ہوس کا ذریعہ بنایا جائے یا اس کا خطرہ لاحق ہو یا اسے اس امر کے امکان کا علم ہو کہ اس شخص کے ساتھ ایسا کیا جائے گا یا وہ ایسی حالت میں رکھا جائے گا اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی 10 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

بھگائے ہوئے یا اغوا شدہ شخص کو بے جا طریقے سے چھپانا یا حبس بے جا میں رکھنا

Wrongfully concealing or keeping in confinement, kidnapped or abducted person

دفعہ368: جو کوئی شخص، یہ جانتے ہوئے کہ کسی شخص کو بھگایا یا اغوا کیا گیا ہے ایسے شخص کو بے جا طریقے سے چھپائے رکھے یا حبس بے جا میں رکھے، اسے اسی طریقہ سے سزا دی جائے گی گویا کہ اس نے اس شخص کو اسی نیت یا علم سے یا اس غرض سے جس سے اس نے اس شخص کو چھپایا یا حبس بے جا میں رکھا ہے بھگایا یا اغوا کیا۔

10 برس سے کم عمر بچے کے جسم پر سے چوری کرنے کی نیت سے اس کو بھگا لے جانا یا اغوا کرنا

Kidnapping or abducting child under ten years with intent to steal from its person

دفعہ369: جو کوئی 10 سال سے کم عمر بچے کو اس نیت سے بھگا لے جائے یا اغوا کرلے کہ ایسے بچے کے جسم پر سے کوئی جائیداد منقولہ بد دیانتی سے لے لے اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی ... تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔

انسانوں کی ناجائز تجارت (Trafficking of person)

دفعہ370: (1) جو کوئی استحصال کی غرض سے، کسی شخص یا اشخاص کو مندرجہ ذیل طریقے سے (الف) بھرتی کرتا ہے، (ب) کہیں بھیجتا ہے، (ج) پناہ دیتا ہے، (د) منتقل کرتا ہے، یا (ہ) حاصل کرتا ہے۔

اول — ڈرا دھمکا کر؛ یا

دوئم — طاقت کا استعمال کرتے ہوئے یا کسی طرح کا دباؤ ڈالتے

ہوئے؛ یا

سوئم—اغوا کر کے؛ یا

چہارم—فریب یا دھوکہ دے کر؛ یا

پنجم—طاقت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر؛ یا

ششم—بہلا پھسلا کر جس میں روپے پیسے کی ادائیگی یا دیگر فائدے پہنچانا شامل ہے تاکہ کسی ایسے شخص کی رضامندی حاصل کی جاسکے جس کا اس طرح بھرتی کیے گئے، کہیں بھیجے گئے، پناہ دیے گئے، منتقل کیے گئے یا حاصل کیے گئے شخص پر کنٹرول ہو؛

وہ ناجائز تجارت (Trafficking) کرتا ہے۔

تشریح-1: ''استحصال'' میں جسمانی استحصال یا کسی بھی قسم کا جنسی استحصال، غلامی یا غلامی جیسے افعال، اطاعت یا اعضا کو زبردستی کاٹ دینا، شامل ہے۔

تشریح-2: (1) ناجائز تجارت کے جرم کے تعین کے معاملے میں متاثر شخص کی رضامندی بے معنی ہے۔

(2) جو کوئی ناجائز تجارت کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے، اسے کم از کم 7 سال کی اور زیادہ سے زیادہ 10 سال تک کی قید بامشقت کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(3) جہاں کہیں ایک شخص سے زیادہ کی ناجائز تجارت کے جرم کا ارتکاب کیا گیا ہو، وہاں کم از کم 10 سال کی قید بامشقت اور زیادہ سے زیادہ عمر قید کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(4) جہاں کہیں کسی نابالغ کی ناجائز تجارت کے جرم کا ارتکاب کیا گیا ہو، وہاں کم از کم 10 سال کی قید بامشقت اور زیادہ سے زیادہ عمر قید کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(5) جہاں کہیں ایک سے زیادہ نابالغ شخص کی ناجائز تجارت کے جرم کا ارتکاب کیا گیا ہو، وہاں کم از کم 14 سال کی قید بامشقت اور زیادہ سے زیادہ عمر قید کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(6) جہاں کسی شخص کو کسی نابالغ کی ایک بار سے زیادہ ناجائز تجارت کے لیے مجرم قرار دیا گیا ہو، وہاں ایسے شخص کو عمر قید کی سزا دی جائے گی یعنی اس کی بقایا قدرتی زندگی تک کی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(7) جب کوئی سرکاری ملازم یا پولیس افسر کسی شخص کی ناجائز تجارت کے معاملے میں ملوث ہو، ایسے سرکاری ملازم یا پولیس کے افسر کو عمر قید کی سزا دی جائے گی یعنی اس کی بقایا قدرتی زندگی تک کی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

خریدے یا بیچے گئے شخص کا استحصال

Exploitation of a trafficked person

دفعہ 370 (الف): (1) جو کوئی، جان بوجھ کر یا یہ باور کرتے ہوئے کہ نابالغ کو خریدا یا بیچا گیا ہے، ایسے نابالغ کو کسی بھی طریقے سے جنسی استحصال کے فعل میں لگاتا ہے تو اسے کم از کم 5 سال کی اور زیادہ سے زیادہ 7 سال کی قید بامشقت کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(2) جو کوئی، جان بوجھ کر یا یہ باور کرتے ہوئے کہ کسی شخص کو خریدا یا بیچا گیا ہے، ایسے شخص کو کسی بھی طریقے سے جنسی استحصال کے فعل میں لگاتا ہے تو اسے کم از کم 3 سال کی اور زیادہ سے زیادہ 5 سال تک کی قید بامشقت کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

عادتاً غلاموں کا کاروبار کرنا (Habitual dealing in slaves)

دفعہ 371: جو کوئی عادتاً غلاموں کی درآمد برآمد کرے، ہٹائے، خرید و فروخت کرے یا تجارت یا بیوپار کرے، اسے سزائے عمر قید یا دونوں میں سے کسی بھی قسم کی 10 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

عصمت فروشی وغیرہ کی اغراض کے لیے نابالغ کو فروخت کرنا

Selling minor for purposes of prostitution, etc

دفعہ 372: جو کوئی 18 سال سے کم عمر کے کسی شخص کو، اس نیت سے کہ ایسا شخص کسی بھی عمر میں عصمت فروشی یا کسی شخص کے ساتھ ''ناجائز جماع'' کی اغراض کے لیے یا کسی ناجائز اور غیر اخلاقی مقصد کے لیے کام میں لایا جائے گا، استعمال کیا جائے گا یا اس امر کے امکان کا علم ہوتے ہوئے کہ ایسا شخص کسی عمر میں بھی ایسی کسی اغراض کے لیے کام میں لایا یا استعمال کیا جائے گا، فروخت کرے، کرایہ پر دے یا دیگر طور پر منتقل کرے تو اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی 10 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(ماخوذ خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم) (بقیہ آئندہ)

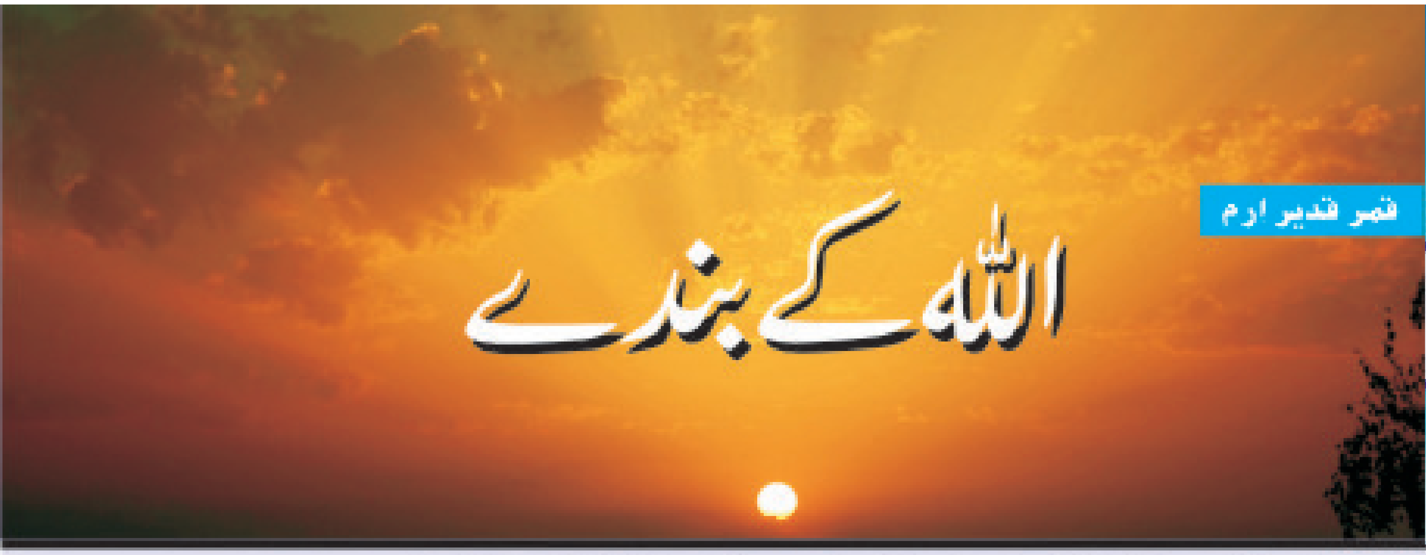

کہانی

اللہ کے بندے

قمر قدیر ارم

سنا بہت تھا بچپن سے کہ خدا جس کو دیتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ بچے تھے تو اکثر چھپروں کے گھروں کو بڑے غور سے دیکھا کرتے کہ خدا ان کو پھاڑ کر کچھ دے گا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ خدا جب اچانک اور بے تحاشہ دولت کسی کو دے دے تو اُس کو ایسا کہا جاتا ہے۔

بہر حال میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کسی کسی کو تو اللہ میاں نے لنگر پھاڑ کر اولاد دے دی ہے۔ ایک دو نہیں پورے 18 بچے اور یہ 18 بچے ہیں ہمارے فیروز ماموں کے۔

فیروز ماموں ہماری امی کے چچازاد بھائی ہیں اور ایک دوسرے چچا کی بیٹی اور ہماری کنّا خالہ ان سے بیاہی تھیں۔ ماموں اُس زمانے میں چھ فٹ لمبے ہی لمبے تھے اور بے چاری کنّا خالہ مشکل سے پانچ فٹ کی گوری چٹی نازک سی۔ پتہ نہیں ماموں کو کیا سوجھی کہ ایک نکاح اور کر ڈالا۔ ایک سانولی سی مرگھلی سی ممانی اور آگئیں اور فیروز ماموں ایسے پھولے پھلے کہ لمبائی بھی چوڑائی میں چھپ کر رہ گئی۔

اب جب بھی ان کے یہاں جانا ہوتا تو ایک نہ ایک ممانی سے نیا نویلا بچہ پالنے میں ضرور نظر آجاتا اور کبھی کبھی تو ایک ساتھ دونوں ممانیوں کے دو دو مولود۔ ماموں کا کاروبار بھی ان کی گرہستی کی طرح ہی انوکھا ہے۔ یوں کہیے کہ کاروبار بھی اور شوق بھی۔ نہ جانے کس کس زمانے کی نادر و نایاب چیزوں سے ڈرائنگ روم، دونوں بیڈ روم، دالان، برآمدے، سب اٹے پڑے ہیں۔ سب طرف بس این ٹیک ہی این ٹیک۔

چھپر کھٹ ——— آبنوسی لکڑی کا، بہت پرانا، جس کی وسعت میں سرہانے کی طرف بڑی سی پینٹنگ جس کے رنگ بدرنگ ہو چکے ہیں۔ اس میں ایک انتہائی حسین عورت گول مٹول طفل شیر خوار کو گود میں لیے، اپنے برہنہ شانوں پر انتہائی مہین بلیک ٹرانس پرنٹ دوپٹہ ڈالے کسی آسمانی مخلوق کی طرح نظر آرہی ہے۔ ایک جانب سنگھار میز ——— وہ بھی آبنوسی۔ بہت اونچے اونچے پائے۔ (اتنے کہ ایک بڑا سا بچہ اس کے نیچے آرام سے بیٹھ جائے) دوہرے آئینے اور ان کی دونوں طرف گل بوٹے۔

الماریوں میں عجیب عجیب طرح کی چیزیں۔

ایک دن فیروز ماموں سے میں نے پوچھا تھا یہ اتنی بڑی چینی کی پلیٹ کہاں کی ہے؟ میں نے اس طرح کے ظروف نواب حیدر آباد کے میوزیم میں دیکھے تھے۔ اُس پلیٹ میں دو مچھلیاں بنی تھیں جو ۹۹ کا ہندسہ بناری تھیں۔ میرا سوال تھا کہ کیا یہ کسی جونتی مہاراج کی ہے۔ ماموں نے بتایا یہ فرانس سے منگائی گئی ہے۔ پھول دان، جن پر اودے اور آسمانی پھول اور بوٹے تھے وہ بھی چینی مٹی کے تھے۔ اُن کے متعلق ماموں نے بادشاہ مینلس (Menelaus) کا نام لیا۔ تو میں حیران رہ گئی۔

کیا ماموں! آپ مذاق کرتے ہیں۔ یہ تو صدیوں پہلے یونان کا بادشاہ تھا جس کی ملکہ کو شہزادہ ٹرائے اُڑا لے گیا تھا۔ آپ بھی ماموں....''

پھر میری نظر ایک شمع دان پر گئی جو کانچ کا تھا لیکن اُس پر بے حد خوبصورت مینا کاری تھی اور ایسی کہ باہر سے نہ اندر سے گویا دوہری پرتوں کے بیچ میں تھی۔ سگار، پیالے، طرح طرح کے مجسمے، فانوس، دیوار گیریاں، لیمپ، پینٹنگس، گھڑیاں اور نہ جانے کیا کیا الم غلم۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب تھا وہ صوفہ سیٹ جس پر ہمیں بٹھایا جاتا۔ لگتا تھا جیسے کسی بابا یاگا چڑیل کی جھاڑو کی سواری کر رہے ہیں۔

ہاں تو میں بات کر رہی تھی ماموں کے بچوں کی۔ جب ایک ایک کرکے اسکول کے لیے کاندھے اور پشت پر بستے ڈالے گھر سے نکلتے تو یوں لگتا کسی اسکول کی چھٹی ہوئی ہے۔ لائن سے بڑے چھوٹے، برابر والے، بڑی خاموشی سے چلے جا رہے ہیں۔

کھانا کھاتے ہوئے الگ الگ بڑے سے تھال میں ایک ساتھ چھ چھ بچے دیکھ کر گمان ہوتا جیسے لنگر چل رہا ہے اور پورے محلّے کے بچے اکٹھے ہو کر کھا رہے ہیں۔ ایسے میں کسی مہمان کو آیا ہوا دیکھ لیں تو مع تھال کے کونوں میں جا دبکیں۔

ابھی حال ہی کا واقعہ ہے بھتیجے کی شادی کا نیوتہ دینے میں بھائی

اور بھابی کے ساتھ فیروز ماموں کے گھر گئی تھی۔ فون پر اطلاع پہلے سے دی جا چکی تھی۔ ماموں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بہت خوش ہوئے۔ میں ان کے عجائب خانے میں ایسے بیٹھی تھی جیسے میری گردن پر کسی بدروح کا پنجہ اب آیا کہ تب آیا۔ کچھ ہی دیر میں ایک بچہ پانی کے گلاس کی ٹرے لیے نمودار ہوا۔ سلام کیا۔ میز پر ٹرے رکھی اور کچھ دور تک نرم قدموں چل کر تیزی سے برابر والے کمرے میں غڑاپ۔ فوراً ہی تقریباً اسی کی ہم عمر ایک لڑکی بسکٹ اور نمکین کی ٹرے لیے قریب آئی۔ سلام کر کے وہ بھی اسی کمرے میں چھپاک۔ تیسرے دور میں پھر دو بچے سیب اور سنگترے لیے حاضر اور سلام کر کے ٹیک قدموں تھوڑی دور تک چلنے کے بعد وہ بھی اسی کمرے میں اُڑن چھو۔ چوتھے دور میں دونوں ممانیاں چائے کے ساتھ ایک جیسی وضع قطع میں برآمد ہوئیں۔

اس دوران میری نظر جو اُس عائب دان قسم کے کمرے کے دروازے پر گئی تو دیکھا کہ سر اوپر نیچے لدے ہوئے وہاں سے ہمیں جھانک رہے ہیں۔ نظر پڑتے ہی سب نظر سے اوجھل۔ میں نے پھر چوری چوری دیکھا اور پھر ان کی چوری پکڑی گئی۔

ہم رخصت کی اجازت ہی چاہ رہے تھے کہ ایک ایک کر کے سب باری باری سے آنے اور پلیٹیں اٹھا کر جانے لگے۔ ماموں نے اس قطار بند فوج کی طرف سرزنش بھری نگاہوں سے دیکھا بھی لیکن وہ اپنی "ذمہ داری" بخوبی نباہنے میں لگے رہے۔ بچے صرف پلیٹوں کو دیکھنے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے لاؤ کی نگاہوں کو دیکھا ہی نہ تھا۔

اُسی بھٹنا چھپر کھٹ پر ایک شیر خوار بچہ آج بھی موجود تھا اس نے بھی غالباً ہماری رخصت کے ارادے کو بھانپ لیا تھا.... اور 'باقیات' میں سے اپنا حصہ بھی مانگ رہا تھا۔ اچانک وہ بھی زور زور سے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ چھپر کھٹ کے سرہانے پینٹنگ والی آسمانی مخلوق کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی تھی۔

میں نے قریب جا کر اپنے اس ننھے منے سے بے چین....کو پکارا۔ آخر میرا بھائی یا بہن جو بھی تھا، تھا تو اپنا ہی۔ باقی لوگ دروازے سے باہر جا چکے تھے۔ اچانک برابر والے کمرے سے آواز آئی۔ جلدی جلدی صاف کر لو۔ کوئی اور مہمان آ گیا تو تو یہ سب اس کے آگے رکھوا دیں گے۔

بھلا ہو فیروز ماموں کا.... اگر انھوں نے یہ سب پڑھ لیا تو میرے کان ضرور کھینچیں گے۔ کہیں گے — گدھی زمانے بھر کی۔ تجھے بھی ان بھوتوں کی دنیا میں قید کر دوں گا۔ پھر پتہ چلے گا اور پھر نہیں معلوم وہ حسب عادت زور کا دہلا دینے والا قہقہہ لگائیں گے یا ہمیشہ کے لیے روٹھ جائیں گے۔

حالانکہ میں نے شفتوں میں سونے اور ٹوائیلٹ کے لوٹے میں سوراخ کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن جس قدر بتا چکی ہوں کیا اتنا ہی ناراضگی کے لیے کافی نہیں ہے؟ مگر میں پھر بھی کہوں گی کہ اللہ اس مہنگائی میں چھپر پھاڑ کر اولاد کسی کو نہ دے۔

فرہنگ آصفیہ (نیا ایڈیشن)

خاں صاحب سید احمد دہلوی

'فرہنگ آصفیہ' اردو کی شہرۂ آفاق لغت ہے جسے خاں صاحب سید احمد دہلوی نے 1892 میں شائع کیا تھا۔ بعد ازاں یہ مختلف طباعتی اداروں سے شائع ہوتا رہا۔ بالآخر منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ سوشل ویلفیئر کے زیر اہتمام ترقی اردو بورڈ نے اس کا عکسی ایڈیشن جہازی سائز میں 1974 میں شائع کیا۔ قومی اردو کونسل بھی اس کو سائز کی تبدیلی کے ساتھ (عکسی ایڈیشن) متعدد مرتبہ شائع کر چکی ہے۔ جہازی سائز کے صفحات کو چھوٹا کرنے سے ایک طرف جہاں الفاظ باریک ہوئے وہیں گڈمڈ بھی ہوئے اور پھر ازاں پلیٹ، سستے کاغذ اور روایتی پریس کی مار نے اس لغت کی حالت خستہ کر دی لیکن تہذیبی تاریخ کے اس وقیع حوالے اور مستند و جامع لغت کو عوام کی پسندیدگی ہر دور میں حاصل رہی۔ اس لغت کی اہم ترین خوبی یہ بھی ہے کہ یہ اپنے عہد کی جملہ روایتوں، قدروں، تہذیبی باقیات، رسوم و رواج، عدالتی و بیگماتی محاورات، پیشہ وروں واہل حرفہ کی اصطلاحات، روزمرہ، ضرب الامثال، اشارے کنائے، تاریخی واقعات، مناسب حال مادّے، تذکیر و تانیث کے نکتے، فلسفہ وطبعیات کی موشگافیاں، نکات علم زبان، اردو صرف ونحو کے قواعد، قدیم وجدید تحقیقات کے ادبی اختلافات مع نظائر نظم ونثر و کثرت معانی و وجہِ تسمیہ، اولیائے ہند اور فقرائے ہند کے اسمائے گرامی مع مختصر حالات، معتبر، مفتخر، مستند علمائے کرام کے اسمائے گرامی اور مختصر سوانحی کوائف کے علاوہ کلاسیکی روایات ولفظیات کی تشریح وتوضیح کے ساتھ ساتھ موسیقی اور اس کے رموز نیز اس کی بندشوں وسُر کی حرکتوں، مُرکیوں، سَم، تال وغیرہ کی جس طرح سید صاحب نے وضاحت کی ہے وہ خاصے کی چیز ہے اور دیگر لغات سے اسے ممیز بھی کرتی ہے۔ ساتھ ہی اسے انسائکلو پیڈیا کے قریب کر دیتی ہے۔ نیز مذکورہ لغت میں الفاظ کے محل استعمال سے متعلق اپنے دور کے مستند شعراء کے اشعار کے ساتھ ساتھ اس عہد کی مقبول ترین ٹھمریوں، دادرا، خیال، لوک گیت، دوہوں، کہہ مکریوں اور پہیلیوں سے بھی مثالیں دی گئی ہیں۔ اس اعتبار سے مذکورہ لغت کو اگر بحر العلوم کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ —— ادارہ

ناولٹ

لالی چودھری

ایک لفظ کہ کشتی

کچن کی کھڑکی ونڈکس سے صاف کرتے ہوئے اس نے باہر دیکھا۔ سورج کی زرد کرنیں بادلوں سے ہوتی ہوئی برڈ آف پیراڈائز کے پتوں اور گھاس پہ روشنی بکھیر رہی تھیں۔ اڑتے ہوئے پرندوں کا ایک غول زیتون کے درخت پہ آن بیٹھا اور خوب زور و شور سے چیں ہانکنے لگا۔ ان میں سے ایک پرندہ دم لینے کے بعد دوسرے پرندوں کی چیں چیں میں میں سے تنگ آ کر پلومار یا کی ٹہنی پہ بیٹھ کر پھولوں کا نکڑ کھانے لگا۔ جب اس کی بھوک مٹ گئی تو وہ بڑی میٹھی آواز میں گانے لگا۔ کنول اسے بڑی محویت سے دیکھتی رہی خود شناس اور اپنے آپ پہ نازاں پرندہ۔ اس کے پر بہت خوبصورت تھے اور وہ ٹہنی پہ کچھ اس شان اور تمکنت سے بیٹھا تھا جیسے وہ پرندوں کا روبی شنکر یا زوبن مہتہ ہو اور بڑی لگن سے موسیقی کی لے ترتیب دے رہا ہو۔

بالوں کی لٹ جو گال سے چپک گئی تھی، پرے کرتے ہوئے کنول فیملی روم میں آ کر کافی ٹیبل پہ پڑے میگزین ٹھیک کرنے لگی۔ دن کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور دوپہر بڑی خاموشی سے پھیل رہی تھی۔ شیلر کے "ODE TO JOY" جیسے خوبصورت دن میں اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ پکنک باسکٹ سجا کر سرپرائز رومینٹک لنچ لیے وہ شاہد کے آفس چلی گئی۔ پیچھے والی پارکنگ لاٹ میں اس کی بی ایم ڈبلیو پارک تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی آفس ہی میں تھا۔ اپنی کار پارک کر کے بلڈنگ کا پچھلا دروازہ اپنی چابی سے کھول کر وہ اندر داخل ہو گئی اور جیسے ہی وہاں جا کر اس نے شاہد کے آفس کا دروازہ کھولا تو اسے کسی BIMBO کے ساتھ کاما سوترا کا سین تخلیق کرتے دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ وہاں سے بھاگنا چاہتی تھی لیکن اس کے قدم قالین سے پیوست ہو کر رہ گئے تھے۔ شاہد اس کی چیخ سن کر ایک دم گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور وہ عورت میز سے اٹھ کر اپنی ڈریس کے بٹن بند کرتی ہوئی آستالا وستا (SEE YOU) کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

''کون تھی یہ؟'' کنول نے آنسوؤں سے رندھی آواز میں کہا۔

"NOBODY IMPORTANT" شاہد نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''اگر غیر اہم لوگوں سے اتنی INTIMACY سے ملتے ہو تو اہم لوگوں سے ملنے کا طور طریقہ کیسا ہے؟''۔

''آئی ایم سوری'' شاہد کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''انگریزی زبان کا سب سے بے معنی لفظ سوری ہے۔ کسی کا دل پاؤں تلے مسلنے کے بعد سوری کہہ دینے سے گھاؤ نہیں مٹتے، یہ المیہ کب سے چل رہا ہے؟''۔ کنول نے غم و غصہ کی ملی جلی آواز میں کہا۔

''یہ بظاہر المیہ نظر آتا ہے لیکن...''

''لیکن ویکن کچھ نہیں''۔ کنول میں مزید کچھ سننے کی تاب نہیں رہی تھی۔ ''ڈیم اٹ شاہد! جب میں نے تمہیں بلڈا کے ساتھ ڈاکٹر پلے کرتے دیکھا تھا، تو تم نے قسمیں کھا کھا کر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ابھی پرانے گھاؤ پوری طرح مندمل نہیں ہوئے اور تم آفس میں...''

غصے اور دکھ سے وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔

''میں قسمیہ کہتا ہوں ہنی! مجھے لورا سے بالکل محبت نہیں، میرے لیے دنیا میں صرف تم ہی ایک عورت ہو جس کے ساتھ میں زندگی گزارنا چاہتا ہوں''۔ وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"TOUCH FOR THIS CLICHE" آفریں ہے اس فلسفے پر کنول نے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی پکنک باسکٹ میز پہ رکھتے ہوئے کہا ''دنیا کی تاریخ میں کتنی لاکھ مرتبہ ہم عورتوں کو یہ ڈائیلاگ سننا پڑا ہے''۔

یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پندرہ سال کی باہمی رفاقت کا ڈرامہ اختتام کو پہنچ چکا تھا اور اس کا آخری سین پیش ہونے کے بعد اسٹیج پہ پردے گرا دیے گئے تھے۔

بہت سوچ بچار کے بعد جب اس نے میرج فسخ کرانے کے لیے عدالت کا رُخ کیا تو مانو دیسی کمیونٹی میں بھونچال آ گیا۔ یہاں تک تو عورتیں اس سے متفق تھیں کہ شاہد سراسر قصوروار تھا، لیکن طلاق جیسا ناگفتنی چار حرفی لفظ کسی کی ڈکشنری میں نہیں تھا۔

شاہد کے جاننے والے مرد حضرات کہتے ''مرد مرد ہی ہے۔ اگر اس نے ادھر اُدھر آنکھیں سینک لیں۔ ہاتھ تاپ لیے یا تھوڑا بہت مونہہ مار لیا تو کون سی قیامت آ گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی چار بیویوں والی بات۔

عمر رسیدہ عورتیں اسے سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

''مرد کا خمیر ہی ایسی مٹی سے اٹھایا گیا ہے کہ وہ دماغ سے نہیں سوچتا۔ تم عقلمند ہو۔ اتنی سی بات پہ گھر مت برباد کرو''۔

''آپ لوگوں کے نزدیک INFIDELITY معمولی بات ہے''؟ وہ غصے سے کہتی۔

''مرد بیچارے بھی کیا کریں۔ یہاں کی عورتیں ایسی آوارہ ہیں کہ خود آ کر مردوں کے پہلو گرماتی ہیں۔ اور پھر مرد کی ذات بھی اللہ نے ایسی بنائی ہے کہ ان کی آنکھ میں سور کا بال ہے۔ کہتے ہیں حجلہ عروسی میں اپنے بستر پہ چاند جیسی دلہن دیکھ کر بھی دولہا کی آنکھ یہ سوچ کر پھڑکتی رہتی ہے کہ ہائے وہ جو دلہن کی شوخ سی سہیلی ستارہ تھی کاش وہ اس وقت میرے پہلو میں ہوتی''۔

بیگم محمود مردوں کی حمایت بھی کرتیں اور ان کی کمینگی کا کچا چٹھا بھی بڑے چٹخارے سے سناتیں۔

لیکن کنول نے یہ کہہ کر سب کا مونہہ بند کر دیا کہ اسے کسی کی جوٹھن نہیں چاہیے اور یہ بھی کہ اگر وہ دو مرتبہ افیئر کرتی پکڑی جاتی تو کیا شاہد اسے رکھ لیتا۔

طلاق ہوئی تو اپنے ملنے جلنے والوں میں اس کی حیثیت اچھوت کی سی ہو گئی۔

مردوں کو بیوی کے روپ میں وہ عورت اچھی لگتی ہے جو کبھی ستائی کبھی سہائی شوہر کی کسی بات میں دخل نہ دے۔ اس خرانٹ اور چلتر کنول نے تو بیچارے شاہد کا پڑا کر کے رکھ دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ آدھی پراپرٹی، بینک بیلنس شاکس اور بانڈز لے گئی بلکہ چائلڈ سپورٹ اور ایلمونی (ALIMONY) بھی لے رہی تھی وہ اسے بائی وے روبری کا نام دیتے اور یہ بھی کہ کنول کا کسی سے یارانہ ہے تبھی تو خاوند کو لوٹ کر لے گئی۔ اپنی بیویوں کو اس سے ملنے سے منع کرتے۔

اس کی دوستوں کی ساسوں کو یہ فکر دامنگیر رہتی کہ بہوئیں کنول سے الٹی سیدھی باتیں سیکھ کر ان کے بیٹوں کی فُرقی نہ کروا لیں اور عورتیں دل ہی دل میں اس سے خائف رہتیں کہ ان کے خاوند کنول پہ ڈورے ڈالنے نہ شروع کر دیں یا یہ کہ وہ کہیں ان میں سے کسی کا خاوند نہ جھپا لے۔

کنول نے اشاروں کنایوں میں ان عورتوں کو بتایا بھی کہ ایسے سوکھے سڑے تنگ نظر اور دو غلے مردوں کو تو وہ اپنے اوپر سے وار کر بھی نہ پھینکے لیکن نہ صرف یہ کہ وہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھتیں بلکہ اسے اپنے مشوروں سے بھی نوازتیں کہ یہ بڑا مکان بیچ کر کہیں سستے علاقے میں دو بیڈ روم کا اپارٹمنٹ لے لے۔ ان کے نزدیک طلاقن کو بڑے گھر کی کہاں ضرورت تھی۔ بڑے گھر تو بیاہتا عورتوں کو ہی زیب دیتے ہیں۔ طلاق شدہ عورت کے لیے تو کٹیا ہی کافی تھی۔ جب جائیداد کی تقسیم کے لیے کورٹ پیشی کی تاریخ آئی تو کنول کی دوست نے جس کے خاوند نے اپنے کرایہ دار سے سابقہ دو ماہ کا 3100 ڈالر کرایہ نکلوانے کے لیے اسمال کلیم کورٹ میں دعویٰ دائر کر رکھا تھا اس نے کہا۔

''چھوڑو یہ سب جنجال چار دن کی زندگی کی خاطر عدالت میں کیوں خوار ہوتی پھرتی ہو؟ شریف لوگ عدالتوں میں نہیں جاتے''۔

''عدالت میرا مسئلہ نہیں ہے کہ میری شرافت پہ داغ لگے گا۔ اور تم چار دن کی زندگی کی بات کر رہی ہو عورت پر تو مرنے کے بعد قبر کے بھی تین دن بہت بھاری ہوتے ہیں''۔

کنول نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

کنول کی طلاق کے تین سال بعد ان کی ایک جاننے والی کا شوہر ہارٹ اٹیک سے چل بسا اور کنول یہ دیکھ کر ٹھگی رہ گئی کہ ہر چیز کی بلا شرکت غیرے مالکہ بننے کے باوجود ناہید لوگوں کی نظروں میں ''بیچاری'' ہو گئی اور راتوں رات عورت سے دیوی بن گئی۔ سبھی لوگ ناہید کے راستے میں بچھ بچھ جاتے۔ ''بیچاری تن تنہا دو بچوں کو پال رہی ہے'' کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اور وہ جو تین سال سے تین بچوں کو اکیلی پال رہی تھی اسے سب حقارت کی نظروں سے دیکھتے اور بڑی حیرت سے پوچھتے کہ ''تم ابھی اکیلی ہو؟''۔ جیسے اس کا اکیلے ہونا کوئی پاپ ہو جب بھی کوئی اس سے یہ سوال کرتا اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے ذہن میں نیوٹرون اور الیکٹرون ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں۔

ناہید کی دوسری شادی بھی سال کے اندر اندر ہو گئی اور کنول کے لیے کوئی پروپوزل بھول چوک سے آ بھی جاتی تو جیسے ہی اس کے طلاق شدہ ہونے کا پتہ چلتا لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتے۔

اسی لیے جب اس کی کمپنی نے لاس اینجلس اور سان فرانسسکو میں

جاب کی پیشکش کی تو اس نے یہ سوچ کر کہ ہو سکتا ہے لاس اینجلس میں لوگ زیادہ میچور ہوں وہاں کی آفر قبول کرلی۔ اسے یقین تو نہیں تھا کہ وہاں اسے مسٹر رائٹ مل جائے گا لیکن ایک امید تھی جیسے بجلی جو ہواؤں میں طوفان سے پہلے موجود ہوتی ہے۔ ایسے بھی اسے سان فرانسسکو اتنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہاں کی دو ہی بڑی صنعتیں تھیں۔ اور ینٹل لوگ اور سیاحت۔ پولی ایسٹر پہنے ہوئے ٹورسٹ ہر جگہ نظر آتے یا شاپنگ کرتے اور اونچی آوازوں میں بولتے ہوئے موٹے بھدے چپٹے لوگ (CHINX) کتنی بری بات تھی کہ وہ اس قدر متعصب تھی لیکن وہ بھی کیا کرتی۔ بھانت بھانت کے ٹورسٹ ہر وقت وہاں موجود رہتے۔

لاس اینجلس میں شور شرابا، ٹریفک جام، سماگ اور پولوشن، پہلے پہل وہ یہاں آکر بھی بہت پچھتائی۔ یہ بھی کوئی زندگی تھی کہ نیند سے جلتی آنکھیں مل مل کر صبح چھ بجے اٹھ جاؤ۔ سونے کی خواہش کا گلا گھونٹ کر شاور کے نیچے کھڑے ہو جاؤ۔ جلدی جلدی تیار ہو کر کام پہ جاؤ۔ دن بھر کام سے تھک ہار کر آدم اور سلمان کی جیں ہال اور باسکٹ بال کی پریکٹس، عشوہ کو سکیٹنگ اور پیانو سکھانے کے لیے لے کر جانا۔ ڈنر کے بعد جب وہ تھک ہار کر بستر پر لیٹتی تو روتے ہوئے خود سے کہتی۔ ''کنول یہ ہے تمہاری زندگی، جس کا بہت سوچ بچار سے تم نے فیصلہ کیا تھا۔ آخر تم میں کون سے سُرخاب کے پر لگے ہیں کہ سمجھوتہ نہیں کر سکتی ہو۔ اسے بہت سی ایسی عورتوں کا پتا تھا جنھوں نے اپنے آدرشوں کا سودا کر کے شاہد جیسے دھوکہ باز شوہروں کی زندگی کے کونوں کھدروں میں اپنے آپ کو فٹ کرلیا تھا۔

میرج کرائسس سے گزرتے دیکھ کر اس کی دوست کارمن نے اسے ایک لاطینی سائیکک کا پتا بتایا تھا جو الفاظ بیچ کر اپنا گزارہ کرتی تھی۔

اس کے بارے میں میکسیکن لوگوں کا کہنا تھا کہ ایک دن وہ دریا پر نہا رہی تھی کہ ایک سپاہی کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے اس عورت کی عصمت لوٹنے کی کوشش کی۔ عورت نے سپاہی کی رائفل سے اسے مار ڈالا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اسی وقت دریا کے دیوتا کی روح اس میں سرایت کر گئی اب وہ دریائی دیوی کہلاتی تھی اور کوئی فانی مرد اسے نہیں چھو سکتا تھا۔ جب وہ دریا کی گہرائیوں میں اپنے دیوتا سے ملنے جاتی تو واپسی پر اس کے کپڑوں پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ہوتا۔ ریت کی طرح خشک دریا سے نکلتی۔

ریجو دی اوسا دس ڈالر سے خوابوں کی ماہیت اور کیفیت بہتر بنا دیتی۔ پندرہ ڈالر لے کر ''دوسری عورت'' کو ایسے ملعون کرتی کہ وہ کسی اور کے شوہر اور محبوب کی نگاہوں سے گر جاتی۔ اور بیس ڈالر میں ایسے منتر بتاتی جس کے جاپ سے بھٹکے ہوئے شوہر اور محبوب قدموں میں آن گرتے۔

''کارمن تمہاری ہمدردیوں کا شکریہ! لیکن مجھے شاہد کو اپنے قدموں میں ڈالنے کی کوئی خواہش نہیں۔ بھگوڑے (SWINGER) کو لے کر مجھے کیا کرنا ہے''۔ کنول نے میٹر آف فیکٹ لہجے میں کہا۔ لاس اینجلس میں اس نے اپنے آپ کو بیوہ ظاہر کیا۔ سب اس کی عزت کرتے لیکن اسے یوں لگتا جیسے وہ بہت بڑی فراڈ ہو۔ وہ اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتی کہ صالح اقدار کے سارے ڈھکوسلے جبریت کے قانون کی پہریداری کے لیے ہیں مگر اسے یوں لگتا جیسے وہ بغیر منزل اور بغیر ایڈریس کے ایک بھٹکی ہوئی مسافر ہو۔ اس وقت وہ یہ سب کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے تکیے میں اپنا سر چھپالیا۔ لیکن یہ کون تھا جو اس کے کانوں میں کہہ رہا تھا کہ اس ATTITUDE کے ساتھ تم جس جہاز میں سوار ہوگی وہ جہاز ڈوبے گا اور جس راستے پہ چلوگی وہ آگے جا کر بھول بھلیوں میں بٹ جائے گا۔ اس نے گھبرا کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ صرف سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا جو اپنی وحشت سے تنگ آکر بھی کبھی بولنے لگ جاتا ہے۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ خوشبودار سالٹس میں ببل باتھ لینے سے ساری کسلمندی جاتی رہے گی یہ سوچ کر وہ کافی دیر تک جھاگ میں لپٹی ٹب میں دیوار سے ٹیک لگائے بلبلوں سے کھیلتی رہی۔ اور ٹب سے نکل کر جب وہ اپنے آپ کو تولیے سے خشک کر رہی تھی تو اس کی ساری یاسیت جھاگ کے ساتھ بہہ گئی تھی اور اس کی جگہ تازگی اور خود اعتمادی عود کر آئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو پھر سے وہی عورت محسوس کرنے لگی جو بیس سال پہلے شاہد کے دل کی دھڑکن بنی تھی۔ ہوا کے جھونکے جسے گدگدا کر گزرتے اور چاندنی کرنیں جس سے سرگوشیاں کرتی تھیں۔

ہونٹوں میں رینگتے ہوئے کسی گرم گرم احساس نے ایک بار پھر اسے ڈانواں ڈول کر دیا۔ وہ کلوزٹ کا دروازہ کھول کر من کے گھر باربکیو پارٹی پہ جانے کے لیے کپڑوں کا انتخاب کرنے لگی۔ بچے تیار ہو کر فیملی روم میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ جب وہ من کے ہاں پہنچے تو سب عورتوں کو لہنگے، شرارے بھاری کام والے سوٹ اور جھلمل کرتی ساڑیاں اور خوب زیور پہنے دیکھ کر اسے ''کوے کالے کے کالے کیا دلی کیا دہرہ دون'' والی کہاوت یاد آگئی۔ باربکیو کے بجائے یہ محفل شادی بیاہ کی پارٹی لگ رہی تھی۔ راجیش اور یونس ہارمونیم اور طبلے پر

ہائے ہائے نی کرتی ململ دی
شاوانی کرتی ململ دی
تیئوں جچ دی بہت ٹیارے
چٹے نارے نی کرتی ململ دی

گا رہے تھے۔ سب کی نظریں بیک وقت کنول پہ اٹھیں جو بلو ڈینم کی اسکرٹ اور کچی ململ کا میکسیکن اسٹائل بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ سمن نے سب سے اس کا تعارف کرایا اور وہ ہر کسی کو تسلیم و آداب اور نمسکار کہتی مشروب کا گلاس لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا مسکراتا چہرہ، نرم گلابی ہونٹ، کندھوں پہ آبشار کی طرح گرتے السی کی رنگت کے بال اس کی آنکھوں کی رومینٹک سی اداسی اور ململ سے جھلکتے دودھ جیسے گورے رنگ کی جگمگاہٹ کے سامنے ہر چیز ماند سی پڑ گئی۔ وہ ان عورتوں میں بیٹھی ہوئی سب سے الگ تھلگ نظر آرہی تھی۔ جیسے جھیل میں کھلا ہوا کنول ہو۔ سب عورتیں بے تحاشا باتیں کررہی تھیں اور وہ خاموش بیٹھی تھی جیسے وہ کنفیوشس کے اس مقولے کی زندہ مثال ہو کہ چپ رہنا دیوتاؤں کی شان ہے۔ مگر وہ دیوی نہیں تھی۔ سر سے پاؤں تک جیتی جاگتی عورت تھی جس کے دائیں ہاتھ میں سٹرابیری کینیل کا گلاس تھا اور بایاں ہاتھ صوفے کے بازو پہ تھا جس میں سے PASSION کی بھینی بھینی مسحور کن مہک اٹھ رہی تھی۔ اور راسلک کا پاجامہ کرتا پہنے اونچا لمبا آصف آنکھوں میں EUREKA (میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا) کی کامرانی لیے کنول کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو ”مجھے پہچانتی ہو نا؟ زمانے کے ہر دور میں وجود کی ہر سطح پر ہم پہلے بھی ملتے رہے ہیں“۔

کنول اٹھ کر کچن میں گئی تو وہ اپنے سارے رکھ رکھاؤ اور ادب آداب بھول بھال کر اس کے پیچھے کچن میں چلا گیا۔ سمن بھی وہیں تھی اس نے پھر سے دونوں کا تعارف کروایا تو وہ ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگا ”میں دراصل چھو کر دیکھنا چاہتا تھا کہ عمر خیام کی رباعیوں جیسا دلربا چہرہ اور مومن کے شعروں جیسے خوبصورت ہونٹ خواب ہیں یا حقیقت“؟

وہ کھل کھلا کر ہنسی ”آپ شاعر تو نہیں“؟۔

”اس معاملے میں اپنی کم مائیگی اور تہی دامنی کا افسوس اب ہو رہا ہے۔ ویسے بائی پروفیشن میں پائلٹ ہوں“۔

”اچھا تو آپ ہواؤں اور فضاؤں میں رہتے ہیں تبھی آپ کے تخیل کی پرواز اتنی بلند ہے“۔

وہ کچن سے نکل کر باہر ٹیرس میں چلی گئی۔

آصف پنچ کا گلاس لے کر اس کے برابر آکھڑا ہوا۔

”لاس اینجلس بڑا تو ہے لیکن اتنا بڑا بھی نہیں کہ آپ میری نظروں سے پوشیدہ رہتیں۔ یہ بتائیں کہ اتنی دیر تک ایل اے کو بے رونق کیوں رکھا؟“۔

”مجھے فنکس سے آئے چھ ماہ ہوئے ہیں۔ شوہر کی وفات کے چند سال بعد ہم نے ایل اے میں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ سمن سے واقفیت ہوئے دو ماہ ہوئے ہیں“ اس نے اپنی مختصری روداد سنا ڈالی۔

”یہ شہر اور اس کے مضافات دیکھنے کے لیے آپ کو گائیڈ کی اشد ضرورت ہے اور مجھ سے بہتر گائیڈ آپ کو کہیں نہیں ملے گا“۔ اس میں ذرا بھی انکساری نہیں تھی۔

بکری سوکنڈ باربکیو چکن کی اشتہا آمیز مہک سونگھتے ہوئے وہ پھر بولا۔

”کیا آپ یہ سپارکس دیکھ رہی ہیں؟“۔

”کون سے سپارکس؟“ وہ اپنے اردگرد اور باربکیو GRILL کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ سپارکس جو بغیر کسی تنبیہ کے دو انسانوں کے درمیان رقص کرنے لگتے ہیں۔ سائنس دان جسے کوئی نام نہیں دے سکتے“۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے سائنس دان اسے برقی مقناطیسیت کہتے ہیں“۔ وہ سنیپل سپ کرتے ہوئے بولی۔

”آپ کو پتا ہے نا کہ ہم سب کی اپنی ایک لطیف سی ارتعاشی سطح ہوتی ہے جس کی لے ہر کسی سے ہم آہنگ نہیں ہوتی“۔

”عام طور پر خوبصورت عورتیں بہت سطحی قسم کی باتیں کرتی ہیں آپ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین بھی ہیں“۔ وہ پنچ کا گلاس ہلاتے ہوئے بولا۔

”بہت بہت شکریہ جناب عالی“ وہ سرخم کرتے ہوئے مسکرائی۔

”محترمہ! کیا آپ اسٹرالوجی پہ یقین کرتی ہیں؟“ وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ اس کے لمس سے عجیب سا احساس، عجیب سا درد اور خوشی اس کے اندر سرایت کر گئی لیکن وہ اپنا ہاتھ آہستگی سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

”میرا تو اسٹرالوجی پہ بھی یقین نہیں ہے“۔

”گائیڈ کے ساتھ ساتھ آپ کو ٹیچر کی بھی ضرورت ہے“۔

ٹیبل پہ کھانا لگ رہا تھا اور اندر ”تو چیز بڑی ہے مست مست“ کی لے پر بہت سے لوگ ڈانس کر رہے تھے۔ آصف کی نظریں کنول کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا اس کی نظریں ان آنکھوں پہ جمی تھیں جن میں وہ بڑی آسانی سے ڈوب سکتی تھی۔ کاش وہ اپنی نظریں دوسری طرف پھیر لے۔ لیکن وہ اسے ٹک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے کنول نے اپنا سارا حوصلہ مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

”آج ذرا سردی ہے“۔

”سردی؟ کیسی سردی؟“۔ وہ پھر سے کنول کا ہاتھ پکڑتے ہوئے

بولا۔ وہ تو اندر ہی اندر جل رہا تھا۔ خون اس کے جسم میں ایکسپریس ٹرین کی طرح دوڑ رہا تھا۔ اس کے لمس سے ایک بار پھر وہ سرشاری کی ایسی دنیا میں پہنچ گئی جہاں اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام طاقتیں سلب ہوگئی تھیں۔ آصف کی انگلیاں زندگی سے ہزار گنا بڑی لگ رہی تھیں۔ کنول کے لیے یہ میٹھا میٹھا درد ناقابل برداشت ہونے لگا تو وہ اپنا ہاتھ کھینچ کر باربکیو گرل کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اپنے ہاتھ سینکنے لگی۔

ڈنر کے بعد جب وہ گھر لوٹی تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان کے کواڑ کا پٹ کھلا ہے اور قوس قزح کی رنگین کمان پکڑے ایک شہزادہ بادلوں کے رتھ پر بیٹھ کر اس سے ملنے آیا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے مڈل ایج ہونے کا اتنی شدت سے احساس ہوا۔ اس نے سوچا آئین اسٹائن ایک اہم نکتہ بھول گیا۔ وقت اضافی تھا لیکن اس کا دارومدار اس بات پہ تھا کہ مادہ مؤنث ہے یا مذکر وہ ہر فارغ لمحے میں آصف کے بارے میں سوچتی، ہر پارٹی میں اس لیے جاتی کہ وہ وہاں ہوگا۔ لیکن اسے دیکھتے ہی اپنا رویہ بدل لیتی ہر کسی سے ہاتھ ملاتی لیکن آصف کو، جو اس کے انتظار میں ہمہ تن منتظر کھڑا ہوتا، کچھ فاصلے سے ''کیسے ہیں آپ؟'' کہہ کر آگے بڑھ جاتی۔

''کنول ایک بازار میں دو بھاؤ کیوں؟'' وہ اس کے ہاتھ نہ ملانے کا گلہ کرتا۔

''گاہک دیکھ کے سودا کیا جاتا ہے''۔ وہ بڑی بشاشت سے جواب دیتی۔

آصف اس کا راستہ روکتے ہوئے اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیتا۔

''آپ مجھ سے اتنا کتراتی کیوں ہیں؟'' وہ ہر وقت ایک سوال پوچھنے پہ کمربستہ رہتا۔

''میں کاسانووا قسم کے لوگوں سے ذرا دور ہی رہتی ہوں'' وہ مسکراتے ہوئے کہتی۔

''میں فلرٹ نہیں کر رہا ہوں کنول میں تو تمھارے عشق حقیقی میں مبتلا ہوں وہ برا مان جاتا''۔

''شیم شیم شیم'' وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہتی ''تین بچوں کی ماں سے عشق انتہائی نامعقول بات ہے''۔

''تین چھوڑ تمھارے تیرہ بچے ہوتے میں پھر بھی یہی کرتا۔ تمھیں پتا ہونا چاہیے کہ

تو اب سے پہلے فلکس میں بس رہی تھی کہیں
تجھے ازل اے میں لایا گیا ہے میرے لیے''

وہ اس کے بازو پہ ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ گنگنانے لگتا اور کنول پھولوں سے لدی ڈالی کی طرح جھول جاتی۔ آصف اسے بتاتا کہ اس نے دن کی سنہری دھوپ اور رات کی نقرئی روشنی میں ساحلوں پہ اٹھکیلیاں کرتی ہوئی بے شمار حسین عورتیں دیکھی ہیں جن کی آنکھیں اپنے آسمان پہ جگمگاتے ستاروں کی طرح چمکتیں اور جسموں سے صندل کی خوشبو آتی۔ اس نے اونٹ کے ہودے میں بیٹھ کر اہرام مصر کی سیر کی ہے۔ استنبول میں بیٹھ کر ٹرکش کافی پی ہے۔ لیکن اس کی زندگی کے سب سے انمول لمحے وہ ہیں جو کنول کے ساتھ بیتے ہیں۔

وہ جس ملک میں جاتا وہاں لینڈ ہوتے ہی سب سے پہلے کنول کو فون کرتا۔

''جاناں تم بہت یاد آ رہی ہو۔ یاد آ کر بہت لطف دے رہی ہو۔ میں تمھیں اپنے بہت قریب محسوس کر رہا ہوں۔ تمھارے جسم کی خوشبو سمیت۔ یوں لگتا ہے جیسے تم مجھے چھو رہی ہو۔ مجھے بے اختیار کر رہی ہو''۔ وہ خدا حافظ کہنے لگتی تو آصف پیار کے لیے مچل جاتا۔ ''کنول جان یہ ایک رسم ہے تعلق کی ورنہ سینکڑوں ہزاروں میلوں سے ٹیلیفون کی تاروں پہ مچلتی ہوئی یہ KISS میری تشنہ لبی کو کیا سیراب کرے گی؟''۔

کنول کے گرد کچے خوابوں کی مہک پھیل جاتی۔ اور اپنے آپ کو سنبھالنے اور پکڑنے کی کوشش میں وہ کٹی پتنگ کی طرح ڈولنے لگتی۔ وہ اس سے دو قدم پیچھے ہٹتی تو وہ چار قدم آگے بڑھ آتا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر لرز جاتی کہ لوگ کہیں گے بڈھی رن زلیخا نام تین بچوں کی ماں کے پچھن ذرا دیکھو۔ بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ رہی ہے اور یہ خود عشق فرما رہی ہے۔ محبت کرنے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ یہ عمر تو اعتکاف میں بیٹھنے کی تھی، عمرہ اور ارض مقدس کی زیارتوں کی تھی۔ لیکن آصف کو دیکھتے ہی نہ جانے اسے کیا ہو جاتا وہ موم بتی کی طرح پگھلنے لگتی۔ اگربتی کی طرح مہکنے لگتی۔ وہ جہاں موجود ہوتا۔ اپنی طلسمی نگاہوں کے اسم منتر سے وہ سارے فالتو سال ایک ایک کر کے غائب کر دیتا اور وہ پھر سے اکیس سال کی ہو جاتی۔ وہ سپنوں میں اسے اپنے سینے سے لگا کر اتنے زور سے بھینچتا کہ اس کی ہڈیاں ترخ جاتیں۔

ایک شام عشو اپنی دوست کے گھر سلمبر پارٹی پر گئی ہوئی تھی۔ آدم اور سلمان اپنی اپنی ٹیم کے ساتھ پام اسپرنگ میں تھے۔ کنول گھر میں اکیلی آصف سے فون پر گھنٹہ بھر باتیں کرنے کے بعد ٹی وی دیکھتی رہی۔ جب وہ سونے کے لیے اٹھی تو چودھویں رات کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ وہ شٹر بند کرنے لگی تو ایک دم اس کے کانوں میں موسیقی رس گھولنے لگی۔ اس نے کھڑکی میں سے دیکھا آصف اپنے گلے میں گٹار

والے کھڑکی کے آگے کھڑا لوئیس میکیل کے گانے سے جو اس کے پاکٹ سائز کیسٹ پلیئر پر چل رہا تھا کنول کو سیرینیڈ کر رہا تھا:

دن میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا
جب میں تم سے دور ہوں
دنیا اتنی مختلف دکھائی دیتی ہے
جب تم میرے پاس نہیں ہوتیں

وہ اس کی دیوانگی پر مسکراتی رہی۔ جب گانا ختم ہوا تو وہ دروازہ کھول کر باہر پورچ میں آکر بیٹھ گئی۔ کیاریوں میں بے صبر لوسی سویٹ ولیم اور جانی جمپ اپ کے پھول کھول رہے تھے۔ وہ بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

''بہت خوب'' وہ تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔

''سیرینیڈ کرنے کا شکریہ مسٹر کاسانووا۔ لیکن آپ کے اس پاگل پن کا کیا علاج کیا جائے؟''۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے مسکرائی۔

''کیا تمھیں یہ بھی پتا نہیں کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا''۔ وہ اس کا ہاتھ چومتے ہوئے بولا اور اپنا ایک گھٹنا ٹیک کر اس کے سامنے ایک زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

''جاناں میں تمھارے بغیر ادھورا ہوں میری تکمیل کر دو میری ہی''۔

یہ کہتے ہوئے اس نے بڑی آہستگی سے کنول کا چہرہ اپنے قریب لاکر اس کی پیشانی سے بال پرے کرتے ہوئے ایک ایک کرکے اس کی آنکھوں کو ایسی ملائمیت اور عقیدت سے چوما جیسے ان سے کوئی معجزہ رونما ہونے والا ہو۔

''یہ سراسر دیوانگی ہے آصف آپ تو مجھے اچھی طرح سے جانتے بھی نہیں۔ ہماری شناسائی کو ابھی چار ماہ ہوئے ہیں''۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے جاناں۔ برنارڈ شا ٹرین میں ایک عورت کو دیکھتے ہی اس پہ دل و جان سے فدا ہو گیا تھا اور اسے اسی وقت یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ عورت اس کی دائمی محبت ہوگی اور ایسا ہی ہوا''۔

''برنارڈ شا سر پھرا رائٹر تھا اور ہم دونوں ذی فہم ذی شعور لوگ ہیں''۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''ویسے بھی تمھیں میرے بارے میں کچھ باتوں کا علم نہیں''۔ ''مثلاً؟''

''رات بہت ہو گئی ہے کل دن میں باتیں کریں گے''۔ کنول اٹھتے ہوئے بولی۔

اس کی جلتی سانسوں کی مہک اور تنفس سے ہمکتا سینہ آصف کو مدہوش کیے دے رہے تھے اس کا دل چاہتا تھا کنول کو اپنی باہوں میں لے کر لائف سیورز (SAVERS) کی طرح اس کے ہونٹوں کو چوس لے لیکن اس ڈر سے کہ وہ اسے اپنے سے علیحدہ نہیں کر سکے گا بنا چھوئے اسے خدا حافظ کہہ کر گٹار اٹھا کر چلا گیا۔

اگلے دن جب آصف اس سے مذاق کر رہا تھا کہ ''چلو جاناں مجھے دکھاؤ اٹیک (ATTIC) میں تم نے اور کتنے بچے چھپا رکھے ہیں؟''۔ تو اس نے آصف کو بتایا کہ ''وہ بیوہ نہیں طلاق شدہ ہے''۔

آصف حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگا۔

''یہ ڈھونگ رچانے کا مقصد؟''۔

''نام نہاد عزت مندی۔ آپ کو کیا پتہ کہ میں کن حالات سے گزری ہوں۔ طلاق کے بعد پاکستانی کمیونٹی میں میری حیثیت جذام کے مریض جیسی تھی۔ ہر کوئی مجھ سے کنی کتراتا تھا۔ فینکس میں جب میری ایک واقف بیوہ ہوئی تو سب نے اسے رابعہ بصری کا درجہ دے دیا میں نے بھی لاس اینجلس آکر اپنے آپ کو بیوہ ظاہر کر دیا''۔

''طلاق کی وجہ کیا تھی کیا تمھارا شوہر ظالم اور سفاک تھا، دراز دستی کرتا تھا؟''۔

''آپ کے نزدیک ظالم اور سفاک کے کیا معنی ہیں؟ کیا تشریح ہے، مجھے معلوم نہیں۔ اپنی آنکھوں سے دو مرتبہ دو مختلف عورتوں سے کام سوتر کا کھیل رچاتے دیکھ کر میں نے طلاق لینے کا فیصلہ کیا تھا''۔

کنول اپنا جواز یوں بیان کر رہی تھی جیسے حجلہ عروسی میں نئی نویلی دلہن اپنے شوہر سے اپنی بے عصمتی کی صفائی پیش کر رہی ہو۔

''تمھارے طلاق شدہ ہونے کے انکشاف پر میں اس قدر شاک میں ہوں کہ میرا دماغ بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا ہے۔ بیوگی قضائے الٰہی ہے اس میں تقدس ہے، پاکیزگی ہے بے بسی اور بیچارگی ہے لیکن طلاق اتنا گھناؤنا لفظ ہے کہ اس سے عورت کی نسوانیت ہمیشہ کے لیے داغدار ہو جاتی ہے۔ میں ابھی تم سے شادی نہیں کر سکتا مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے''۔

ترکِ تعلق کے یہ بے درد الفاظ کتنے سفاک اور سنگدلانہ قطعیت کے حامل تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا آصف سے کہہ دے کہ وہ پینیلپی (PENELOPE) نہیں جو یولیسس کے انتظار میں ساری عمر بیٹھی اپنا عروسی نقاب ادھیڑتی بنتی رہے لیکن آنسو اس کے گلے میں روڑے بن کر اٹک رہے تھے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ فضا میں ان کہے الفاظ کا بوجھل پن چھایا ہوا تھا۔ وقت یوں ٹھہر گیا تھا جیسے آنسو آنکھ سے ڈھلک کر گال پر آکر تھم جائے۔ آصف چلا گیا تھا اور وہ شکستہ عقیدے بھولی ہوئی دعائیں اور کرچی کرچی دل لیے بیٹھی تھی۔ ●●●

کہانی

کسک

ڈاکٹر عشرت ناہید

ثنا کی زندگی خانہ بدوشوں کی طرح تھی کیونکہ اس کے شوہر عامر کی ملازمت ہی ایسی کمپنی میں تھی کہ تبادلہ مستقل ہوتا رہتا تھا وہ کسی شہر میں تین سال سے زائد نہیں رہی تھی۔ یونہی شہر شہر گھومتے ہوئے وہ اس خوبصورت نگر میں آگئی تھی جو اپنی تہذیب کے لیے پہچانا جاتا تھا، جہاں قدم قدم پر تاریخ کے زرد اوراق کی طرح اپنے اندر داستانوں کا ذخیرہ لیے ہوئے عمارتیں بکھری پڑی تھیں۔ وہ شہر جس کی گومتی میں کبھی ایک لاکھ ناؤ گھوما کرتی تھیں جنھوں نے اس شہر کو "لکھ ناؤ" نام دیا تھا مگر اب وہ ناؤ کہاں؟ گومتی کا دامن آج کے انسان کے دل کی طرح سکڑ کر اتنا چھوٹا ہو چکا تھا کہ ایک لاکھ تو کیا ایک سو ناؤ بھی نہ سما سکیں، مگر پھر بھی گومتی کی ہر ایک لہر ایک کہانی بیان کرتی ہوئی سی محسوس ہوتی۔

اس کے فلیٹ کے سامنے گومتی کا دلفریب نظارہ تھا جس کے کنارے پر آباد مندروں کی تھرتی گھنٹیاں صبح سویرے اور شام ڈھلے جب بجتیں تو کانوں کو بڑی بھلی معلوم ہوتیں ایک پاکیزگی کا احساس دلوں میں پیدا کرتیں۔ صبح سویرے پنڈت گومتی میں اشنان کر کے گھنٹی کو مسلسل بجاتے ہوئے دودھ اور پھر گنگا جل سے کرشن جی کی مورتی کو اشنان کراتے پھر بڑی عقیدت سے اس کو پھولوں کی مالا پہناتے ہوئے شلوک پڑھتے تو ان کے پوتر بول خاموش فضا میں گونجنے لگتے۔

اسی وقت مسجدوں میں اذانیں ہونے لگتیں تو ایک نئی سحر انگیزی ماحول پر طاری ہو جاتی، پیڑ پودے جھوم جھوم کر حمد و ثنا کرتے تو پرندے بھی اپنی چہچہاہٹ کے سر ان میں ملا دیتے۔ اس روح پرور منظر کو وہ روز اپنے گھر کی بالکونی سے دیکھا کرتی، ایک سکون سا اپنی روح میں اترتا محسوس کرتی اور اسی نورانیت کی چادر تلے نماز ادا کرتی۔

بہت جلد ہی اس کا دل اس شہر میں لگ گیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اسے یہاں اجنبیت کیوں محسوس نہیں ہوتی، یہاں کی فضائیں اتنی اپنی اپنی سی کیوں ہیں ایسا پہلے تو کبھی کسی جگہ پر نہیں ہوا ہر جگہ اسے سیٹ ہونے میں الجھن اور وقت دونوں ہی لگا کرتے تھے، ہر نئے شہر کی فضائیں اجنبی ہی لگا کرتی تھیں ان سے مانوس ہوتے ہوتے ایک لمبا عرصہ بیت جایا کرتا تھا اور کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ کسی شہر میں دل لگا ہی نہیں اور عامر کا تبادلہ ہو گیا۔ اس لیے وہ حیران تھی کہ اس شہر میں ایسا کیا ہے جو اسے اتنی اپنائیت محسوس ہوتی ہے ابھی تو یہاں کسی سے شناسائی بھی نہیں ہے پھر کیوں ایسا لگتا ہے کہ یہ ہوائیں، یہ ندی کا کنارہ، یہ فضائیں، یہ مندروں کی تھرتی گھنٹیاں، یہ اذانیں ان سب سے اس کا کوئی ناطہ ہے یہ سب اس کے ساتھی ہیں، یہ سب اس کے رازدار ہیں مگر اس کے پاس تو کوئی ایسا راز نہیں، یہ ہوا جب اس کے پاس سے سرگوشی کرتی ہوئی گزرتی ہے تو اسے ایسا کیوں لگتا ہے کہ وہ اس سے کچھ کہہ رہی ہے جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی ہے۔ اکثر شام ڈھلے وہ بالکونی میں چائے کا کپ لیے بیٹھی ہوتی اور سوچتی رہتی۔ یہ داستانوں سے بھرا شہر ہے کہیں کوئی فوق فطری شے اس کے آس پاس بسیرا تو نہیں کر گئی؟ تب ہی اس کی نظر سامنے دیوار پر پڑی ایک بڑی سی چھپکلی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی اور ایک جھٹکے سے اس نے چھوٹی سی معصوم سی تتلی کو نشانہ بنایا۔ تتلی پوری قوت سے چھٹپٹائی اور اس کی گرفت سے نکل کر نیچے گر پڑی لیکن زخمی ہو چکی تھی دوبارہ اڑ نہ پائی اور دم توڑ گئی۔ یہ منظر اس کے ذہن پر ثبت ہو گیا دل درد سے بھر آیا۔ وہ اٹھ کر اندر چلی آئی۔

ویک اینڈ پر ثنا اور عامر نے شہر کے تاریخی مقامات دیکھنے کا پروگرام بنایا تو سب سے پہلے بڑے امام باڑے جانے کے لیے سوچا کیونکہ یہاں دیکھنے لائق جو کچھ بھی تھا ان میں امام باڑے ہی سب سے اہم تھے، راستے پتہ نہیں تھے انٹرنیٹ سے مدد لی اس کے باوجود وہ بھٹک گئے اور بجائے امام باڑے کے مرکزی دروازے والی سڑک کے پیچھے والے راستے پر پہنچ گئے گنجان سا علاقہ تھا جہاں کچھ پرانی طرز کے شکستہ سے مکانات تھے گاڑی روک کر ایک بزرگ شخص سے آگے کا راستہ پوچھا:

''بھائی صاحب، امام باڑے جانا تھا ہمیں راستہ کدھر سے ہے؟''

وہ ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو اس کے

اس طرح دیکھتے اور کوئی جواب نہ دینے پر عامر نے زور سے سوال دہرایا۔

''جناب راستہ بتا دیجیے۔''

'جی جناب' وہ سنبھلا اور بولا'' آپ حسین آباد امام باڑہ کے پیچھے آگئے ہیں اب آپ یہاں سے سیدھے جائیں ایک ترایا آئے گا اس کے دائیں جانب مڑ جائیے گا پہلے رومی دروازہ آئے گا اس کے بعد پھر امام باڑہ ہے''

شکریہ کہتے ہوئے عامر نے گاڑی آگے بڑھا دی مگر وہ وہیں رہ گئی کون تھا وہ شخص، کیوں جانا پہچانا سا لگا وہ بھی تو مجھے جیسے پہچاننے ہی کی کوشش کر رہا تھا اس نے جلدی سے سر کو جھٹکا اور عامر سے باتوں میں مشغول ہوگئی۔

امام باڑہ کے بڑے گیٹ میں داخل ہوتے ہی ایک الگ سماں نظر آیا وہاں ششماہی کی مجلس ہونے والی تھی جس میں حضرت امام علی موسیٰ رضا تشریف لا رہے تھے، مراثی کی ریکارڈنگ گونج رہی تھی جس سے ثنا پر رقت سی طاری ہونے لگی۔ دریائے فرات، وہ معصوم علی اصغر کے پیاسے لب، وہ عباس علمدار کے شانے پر جھولتا سکینہ کا مشکیزہ، ہائے وہ سکینہ بابا کی لاڈلی، چچا کی گودوں کھیلی، وہ معصوم علی اصغر وہ کربلا کے غریب الوطن جنہیں لوٹنا نصیب نہ ہوا، سارا درد تازہ ہو چلا تھا۔ بڑے سے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی سب کچھ دیکھا دیکھا سا لگ رہا تھا، اس نے تو کبھی تصویریں بھی نہیں دیکھی تھیں یہاں کی پھر کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ وہ پہلے بھی یہاں آچکی ہے۔ بڑے امام باڑے کے دو دروازے تھے دوسرے دروازے کے لیے انیس سیڑھیاں تھیں ہر سیڑھی ثنا کو ایک نئی دنیا کی طرف لے جا رہی تھی اندر جانے کا ٹکٹ اسی گیٹ پر مل رہا تھا اندر سیدھا راستہ مرکزی عمارت کی طرف جاتا تھا راستہ ختم ہونے پر پھر سترہ سیڑھیاں تھیں اسی کے دائیں جانب آصفی مسجد اور بائیں جانب باؤلی تھی سامنے چوڑی سیڑھیاں جو امام باڑے کی مرکزی عمارت کی طرف جاتی تھیں جیسے جیسے وہ سیڑھی پر قدم رکھتی جا رہی تھی اس کی بے کلی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، دل کا سکون ختم ہوتا جا رہا تھا۔ اوپر چڑھ کر بڑا سا چبوترا اس کے بائیں طرف بھول بھلیاں تھیں۔ وہ پہلے اندر گئے زیارت کی۔ تعزیے اور اندر کے مناظر نے پھر اسے ایک اجنبی مگر مانوس سی فضا میں لا کھڑا کیا تھا چاہینا ہال جس میں خواتین بیٹھ کر مجلس سنا کرتی تھیں اس کے کونے میں اسے کالے ماتمی لباس سے سرسراتے محسوس ہو رہے تھے واقعۂ کربلا کی یاد تازہ ہوئی جا رہی تھی درد و غم کی فضا چہار سو طاری تھی زیارت کے بعد باہر نکلے تو گائیڈ منتظر کھڑا تھا بھول بھلیاں کی طرف لے جانے کو مگر وہ گائیڈ کی پروا کیے بغیر اپنے آپ میں گم سی آگے بڑھ گئی تھی۔ عامر گائیڈ اور دوسرے سیاح کے ساتھ باتیں کرتا ہوا آ رہا تھا وہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ یہاں پہنچنے کے بعد سے وہ کچھ کھوئی کھوئی سی ہے مگر اس نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی کہ شاید مراثی اور ماحول کا اس پر گہرا اثر ہو رہا ہے اور وہ رنجیدہ اور مغموم ہے مگر ثنا پر تو کوئی اور ہی کیفیت طاری تھی کہ سب کچھ اپنا اپنا سا کچھ بھی نیا نہیں یہ ہوائیں یہ فضائیں یہ مناظر سب کچھ دیکھے دیکھے سے، وقت تھما تھما سا، وقت، یہ وقت بھی کیا چیز ہے، کبھی ٹھہرتا ہے تو صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے، کبھی چلتا ہے تو لمحوں میں صدیوں کی مسافت طے کر لیتا ہے، کبھی زندگی کو روک دیتا ہے تو کبھی زندگی کو اپنے پروں پر اڑا لے جاتا ہے، وہ اپنے خیالوں میں گم تھی کہ عامر نے آواز دی۔

''ثنا ٹھہرو بھی تم تو ایسے آگے جاتی جا رہی ہو جیسے سب چیزوں سے واقف ہو۔''

اس نے مڑ کر عامر کو دیکھا اور کہنے لگی۔ آیئے آپ میرے ساتھ گائیڈ سب کو جمع کرنے میں دیر لگا رہا ہے ہم تب تک اوپر چلتے ہیں۔''

بھول بھلیاں کی اونچی اونچی سکڑی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے وہ دونوں 489 راستوں پر بھٹکا دینے والی بھول بھلیاں پر پہنچ چکے تھے۔

اب رک کر ذرا گائیڈ کا انتظار کر لیتے ہیں ورنہ ہم بھٹک جائیں گے'' اس نے آگے بڑھتی ثنا کو روکتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھٹکیں گے میں تو ہوں آپ کے ساتھ۔''

اس کی آواز بدلی بدلی سی تھی۔ عامر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ آگے ایک راستے کی طرف بڑھنے کو تھی کہ عامر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

تب تک گائیڈ دیگر لوگوں کو لے کر اوپر آچکا تھا وہ بھول بھلیاں کی تاریخ بتا رہا تھا کہ ایران کے انجینئر کفایت اللہ نے یہاں کی دیواریں کچھ اس طرح سے بنائی ہیں کہ یہ سرگوشیاں سن ہی نہیں لیتیں بلکہ ان سرگوشیوں کو دوسرے کو سنا بھی دیتی ہیں۔

''آپ یہاں دیوار کے قریب آ کر کچھ کہیے بالکل ہونٹوں ہی ہونٹوں سے اور میڈم آپ وہاں دور جا کر دیوار سے کان لگایئے۔''

عامر نے دیوار میں ہونٹ لگا کر کہا۔ ''ثنا تم میری زندگی ہو''، وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔''

''آپ تو عاشقوں سی باتیں کرنے لگے'' وہ بھی ہنس پڑا'' چلو شوہر والی بات سنو۔''

اسے ستی ہو آج شام کو کیا پکار رہی ہو؟ اور ہاں تم نے میرے آفس کے کپڑے استری کر دیے۔"

اس کی باتوں پر ہنستے ہنستے ثنا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے پھر سے دیوار پر کان لگا دیے، "تم آ گئیں تمہیں آنا ہی تھا نا ایک دن۔"

اس نے چونک کر عامر کو دیکھا وہ تو گائیڈ سے فن تعمیر کے بارے میں بات کر رہا تھا پھر کس کی سرگوشی تھی میرا وہم ہوگا اس نے سر کو جھٹکا اور عامر کے قریب ہو گئی لیکن پورے وقت باوجود کوشش کے وہ اس آواز کے حصار سے باہر نہیں آ پائی کہ کوئی اس کے آس پاس ہے کوئی ہر قدم یہاں اس کی رہنمائی کر رہا ہے نہ تو اسے کوئی ہیولی نظر آیا نہ ہی کوئی ایسی چیز لیکن بس ایک بازگشت تھی جو صرف اسے سنائی دے رہی تھی اور مسلسل اس پر اپنی گرفت مضبوط کرتی جا رہی تھی، کبھی اسے لگ رہا تھا کہ یہاں کے در و دیوار اس سے باتیں کرنا چاہ رہے ہیں، کوئی ان سنی کوئی ان کہی سی داستاں ہے جس کے لیے اس کا انتظار تھا اور اب یہ در و دیوار اسے سنانے کے لیے بے قرار ہیں، وہ کبھی بھوت چڑیل یا آسیب پر یقین نہیں کرتی تھی مگر کچھ تو تھا جو اسے الجھا رہا تھا وہ سوچوں میں گرفتار تھی اس کی چال خود بخود دھیمی ہوتی جا رہی تھی وہ بار بار پیچھے رہ جاتی تھی اور عامر آواز دیتا تھا اب کے عامر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ لے لیا تھا۔ اب وہ باؤڑی (باؤلی) کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے ہی اس کے اندر جھانکا بہت گہرائی تھی اس میں اسے کچھ نظر نہ آیا مگر پھر بھی وہ بری طرح ڈر گئی سہم کر پیچھے ہٹ گئی اسی باؤلی کی گہرائی میں اودھ کے خزانے کا نقشہ اور چابی بھی ڈال دی گئی تھی اور بھی نہ جانے کیسے کیسے راز دفن تھے۔ وہ سوچ رہی تھی یہ تاریخ بھی نا کتنی بے رحم ہوتی ہے کتنی ہولناک کہانیاں اس کے دامن میں بکھری پڑی ہوتی ہیں مگر پھر بھی کبھی اس کا دامن بھرتا نہیں صدیاں سمیٹے چلی جاتی ہے، نہیں یہ تو ڈائن ہے جو کروڑوں سالوں سے آدم کی اولادوں کو کھائے جا رہی ہے مگر اس کا پیٹ بھرتا ہی نہیں جانے کب یہ شکم سیر ہوگی۔ عجیب عجیب سوچیں اسے اپنی لپیٹ میں لیے تھیں۔ وہ جب گھر پہنچے تب تک شام گہری ہو چلی تھی تھکن بھی زیادہ تھی اس وجہ سے نیند کی دیوی نے اسے جلد ہی اپنی آغوش میں لے لیا تھا رات کے کسی پہر دروازے پر دستک ہوئی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی کہ شاید صبح ہو گئی اور کام والی نے دروازہ بجا دیا۔ وہ حیران ہو رہی تھی اپنی گہری نیند پر کہ اتنی دیر تک وہ سوتی رہی اذان کی آواز پر بھی اس کی نیند نہیں کھلی تب ہی اس کی نظر سامنے لگی گھڑی پر پڑی رات کے دو بج رہے تھے۔ وہ اور پریشان ہو گئی اس وقت کون آ سکتا ہے؟

اس نے عامر کو جگایا "اٹھیے کسی نے دروازہ بجایا ہے؟ اس وقت کون ہوگا؟ سو جاؤ صبح دیکھیں گے۔"

"دروازہ کوئی ابھی بجا رہا اور آپ کہتے ہیں صبح دیکھیں گے جلدی اٹھیے دیکھیے کون ہے؟"

"کون ہوگا اس وقت" بڑبڑاتے ہوئے وہ باہر گیا کوئی نہیں تھا۔

"دیکھو میں نے کہا تھا نا کوئی نہیں ہے بلا وجہ نیند خراب کر دی۔"

"لیکن میں نے باقاعدہ دستک کی آواز سنی تھی۔"

دستک!!! وہ حیرانی سے بولا۔

"حد ہے ڈور بیل چھوڑ کر کوئی دستک کیوں دے گا۔ چلو چپ چاپ سو جاؤ کچھ خواب دیکھا ہوگا۔"

وہ کچھ نہ بولی اور لیٹ گئی اور پھر دعائیں پڑھتے پڑھتے نہ جانے کب سو گئی۔ پھر تو یہ ہر دوسرے دن کا معمول سا ہو گیا کہ ثنا جب گہری نیند میں ہوتی اسے دستک کی آواز آتی اور وہ نیند سے چونک کر اٹھ بیٹھتی وہ عامر کو جگاتی وہ چار بار وہ اس کے کہنے پر دروازے تک جا کر کبھی باہر تک جا کر دیکھ بھی آیا مگر کوئی نہ ملا تب اس نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا۔

"دیکھو ثنا تم دن بھر گھر میں اکیلی رہتی ہو یہ ہارر سیریل اور ہارر فلمیں نہ دیکھا کرو یہ تمہارے دماغ میں خلل پیدا کر رہی ہیں۔"

"میں تو ایسی کوئی چیز دیکھتی ہی نہیں۔"

"تو پھر کیا دعائیں پڑھ کر اور حصار باندھ کر سونا چھوڑ دیا ہے؟"

"نہیں ایسا بھی نہیں ہے میں پابندی سے حصار باندھ کر اور چاروں طرف دم کر کے ہی سوتی ہوں۔"

"پھر کیا بات ہے تمہیں یہ دستک کیوں سنائی دیتی ہے جو مجھے تو کبھی سنائی نہیں دیتی۔"

"پتہ نہیں لیکن میرا یقین کیجیے دستک اتنی واضح ہوتی ہے کہ مجھے صاف سنائی دیتی ہے اور میری نیند اسی آواز سے ٹوٹتی ہے۔"

دن بھر اسے گھر میں بھی کسی کی موجودگی کا احساس رہتا وہ ابھی ابھی سی رہتی اس کی صحت پر بھی اثر پڑنے لگا تھا جس کی وجہ سے عامر بھی فکر مند ہونے لگا تھا۔ اس رات بھی وہ گہری نیند سے جاگی تھی اسی ٹھک ٹھک کی آواز پر پھر اسے بہت دیر تک نیند نہ آئی وہ دعائیں پڑھتی رہی پھر نہ جانے کس پل اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی کہ ایک آواز نے اس کے ہوش اڑا دیے۔

"ارے ثنا بٹیا تم تو پھر سونے لگیں کیا میرے دیس میں آ کر بھی کہانی نہ سنو گی؟"

آواز سنتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔

''دادی۔''۔''بھیّی والی دادی۔''

عامر ہڑبڑا کر نیند سے بیدار ہوا وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔

''ثنا ثنا کیا ہوا؟''

''کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی کیا؟''

''نہیں نہیں عامر اب تو صاف آواز ہی لگائی ہے دادی نے۔''

''دادی نے؟'' عامر حیران ہو رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔

''دادی کون دادی۔''

''عامر یہ ایک بہت درد بھری داستان ہے۔''

لو پہلے پانی پیو اور پھر بتاؤ کیا ہوا؟'' پانی پی کر اس کی طبیعت بحال ہوئی۔

عامر، وہ میرے ابا کی ممانی تھیں ان کی رضاعی ماں بھی تھیں اس رشتے سے وہ میری دادی ہی تھیں۔ سب کہتے تھے کہ مجھ میں انہی کی شباہت ہے۔ دادی بہت نفیس خاتون تھیں گول چہرہ سفید دودھ سی رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں سی ناک، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، بوٹا سا قد، جسم قدرے فربہی مائل، سفید براق سا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ اس پر سفید ہی ململ کا بڑا سا دوپٹہ۔ نفاست تو جیسے رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی ہر کام میں ایسا سلیقہ، اٹھنے بیٹھنے کا انداز، نزاکت اور نفاست کسی بھی بات میں پورے خاندان بھر میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔ کسی کام میں کمی ان سے برداشت نہ ہوتی تھی۔ دیوان پر پڑی چادر کا ذرا سا بھی کونا ترچھا ہوتا جب تک سیدھا نہ کر لیتیں یا کروا لیتیں انہیں چین نہ آتا، جازم پر پڑی سلوٹ بھی ان کے سر درد کا باعث بن جایا کرتی تھی، جب بات کرتیں تو منہ سے پھول جھڑنے والی کہاوت صادق آتی۔ لیکن دادی کا ناطہ گومتی سے ٹوٹ کر ٹھپرا سے کیسے جڑ گیا تھا اس راز سے وہ خود بھی ناواقف تھیں۔ زندگی نے اور ان کی قسمت نے ان کے ساتھ کچھ ایسی زیادتی کی تھی کہ وہ تو درد سے اف بھی نہ کر پاتی تھیں۔

''کیا ہوا تھا ان کے ساتھ؟ وہ ٹھپرا کے تٹ تک کیسے پہنچی تھیں کچھ تو علم ہوگا؟''

عامر، وہ بہت مظلوم تھیں بس وہ اتنا ہی بتاتی تھیں کہ ان کا تعلق ایک اچھے خاندان سے تھا، ان کے والد کی ایک کپڑے کی دکان تھی، وہ اور ان سے چھوٹا ایک بھائی صمد اور پھر ایک ننھی سی بہن تھی، جب چھوٹی بہن پیدا ہوئی اس وقت ان کی اماں کا انتقال ہو گیا تب ان کی عمر دس سال تھی بھائی سات سال کا اور نومولود بہن فقط دو ماہ کی۔ اس چھوٹی سی بہن کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا نانی اور دادی پہلے ہی اس دنیا سے جا چکی تھیں صرف ایک چھوٹی خالہ تھیں جنہیں ہم خالہ باجی کہا کرتے تھے نانا نے ہم بچوں کا خیال کرتے ہوئے خالہ باجی کا نکاح اپنے سے دوگنی سے بھی زیادہ عمر کے میرے ابا سے کر دیا اور ایک رات خاموشی سے خود بھی ہماری امی اور نانی کے پاس چلے گئے۔ ہم بہت خوش تھے کہ خالہ باجی اب ہمارے گھر ہی رہنے لگی تھیں مگر وہ اب ہم سے ویسی محبت نہیں کرتی تھیں جیسی امی کی زندگی میں کرتی تھیں اب تو وہ ذرا سی غلطی پر ہمیں دھنک کر رکھ دیتی تھیں۔ اگر ہم ابا سے کچھ کہہ دیتے تو ان کے جانے کے بعد ہماری اور زیادہ پٹائی ہوتی اس لیے ہم دونوں بھائی بہن ابا سے بھی کچھ نہ کہتے۔ امی نے اپنی زندگی میں ہی میرا رشتہ گلی کے کونے پر رہنے والی خالدہ پھوپھی کے بیٹے ساجد سے کر دیا تھا جب ہماری منگنی ہوئی اس وقت ساجد کی عمر بمشکل چودہ سال اور میری نو سال تھی ہم بہت خوش تھے ساجد اکثر گھر آیا کرتا تھا اور ہم خوب کھیلتے تھے مگر امی کے جانے کے بعد سے مجھے کھیلنے کا وقت ہی نہیں مل پاتا تھا گھر کے کام اور پھر چھوٹی کو سنبھالنا میری ذمہ داری سا بن گیا تھا۔ اب ساجد جب بھی آتا صمد کے ساتھ کھیلتا رہتا اس کی موجودگی مجھے اچھی لگتی کیونکہ جب میں صحن میں کام کر رہی ہوتی اور خالہ باجی اندر کمرے میں ہوتیں تو وہ کچھ کچھ کاموں میں میرا ہاتھ بھی بٹا دیتا تھا اس دن بھی میں مصالحہ پیس رہی تھی نہ جانے کیسے وہ بڑا سا بٹا سل پر پس رہے مصالحے کے بجائے میری انگلیوں کو زخمی کر گیا اسی وقت ساجد آ گیا میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس نے میری زخمی انگلیوں کو دیکھا جلدی سے پانی سے انہیں دھویا اور کس کے دبایا کہ خون بہنا رک جائے اسی اثنا میں خالہ باجی نکل آئیں اور یہ منظر دیکھ کر بھڑک اٹھیں وہ ساجد کو ڈانٹنے لگیں کہ ''یہ کیا کر رہے ہو؟'' ان کے انداز پر ساجد کو بھی غصہ آ گیا۔

''آپ اس سے اتنا محنت کا کام لیتی ہیں دیکھیے کیسی چوٹ لگی ہے اسے۔''

''کوئی چوٹ ووٹ نہیں ہے ذرا ذرا سے کام میں نخرے دکھاتی ہے۔ چل جلدی کر ادھر چھوٹی نے بھی گندگی کر رکھی ہے چھوڑ گئی ماں میرے سر سب کو۔''

''یہ ذرا سا کام ہے خالہ باجی؟ آپ خود کیوں نہیں کرتیں یہ کام؟''

بس خالہ باجی کا پارہ انتہا کو پہنچ گیا وہ چوٹ کھائی ناگن کی طرح پھنکاریں۔

''ہوتا کون ہے تو جو حمایتی بنے چلا جا رہا اور تیری اتنی مجال کہ مجھ سے اتنی زبان لڑائے۔''

''میں اس کا منگیتر ہوں اور یہ میری دلہن ہے۔''

''منگیتر ہی ہے نا نکاح تو نہیں ہوا نا دیکھتی ہوں اب یہ کیسے تیری دلہن بنتی ہے۔''

''نکل جا یہاں سے اور اب دوبارہ قدم مت رکھنا یہاں۔''

''میں ابھی جا کر اپنی امی کو سب بتاتا ہوں کہ آپ اس پر کیسا ظلم کرتی ہیں۔''

''ہاں ہاں جا بتا دے۔''

اس کے بعد کیا ہوا مجھے نہیں معلوم ساجد دوبارہ گھر نہیں آیا تھا ہاں اتنا ضرور تھا کہ ابا جب دکان سے آئے خالہ باجی کو انھوں نے نہ جانے کیا کہا تھا وہ چپ چپ رہنے لگی تھیں اور ابا ہمارا دھیان زیادہ رکھنے لگے تھے ہمیں ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دیتے۔ کچھ دن سے خالہ باجی ابا کے دکان جانے کے بعد رکشہ میں بیٹھ کر کہیں چلی جاتی تھیں اس دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ چلو میری سہیلی کے گھر تم بھی ساتھ چلو میں نے کہا 'چھوٹی؟؟' کہنے لگیں اسے بھی ساتھ لے چلیں گے صمد اسکول جا چکا تھا۔ وہ رکشہ سے ہمیں کہیں لے گئیں ان کی سہیلی بہت بڑی سی عورت تھیں مجھ سے بہت پیار سے باتیں کر رہی تھیں چھوٹی کو بھی انھوں نے خوب پیار کیا پھر ہمیں چائے دی چائے پینے کے بعد مجھے نیند آ گئی پھر میرے ساتھ کیا ہوا مجھے کچھ خبر نہیں جب میری نیند کھلی میں ٹرین میں تھی ایک ابا کے جیسا آدمی پاس بیٹھا ہوا تھا میں ڈر کر رونے لگی تو اس نے مجھے جھڑک کر چپ کر دیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا میری خالہ باجی میری چھوٹی' وہ بولا سب گھر پر ہیں اس کے بعد مجھے پھر نیند آ گئی۔ جب میں دوبارہ جاگی تو اپنے آپ کو ایک اجنبی گھر میں پایا ایک خاتون اداس سی میرے پاس بیٹھی تھیں میں ان سے رو رو کر پوچھتی رہی کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے مجھے میرے گھر پہنچا دو، مجھے میری چھوٹی اور بھائی کو دیکھنا ہے، مگر وہ بھی خاموشی سے میرا منہ دیکھتی رہیں پھر مجھے گلے لگا کر رو پڑیں کہ بس اب یہی تمھارا گھر ہے پھر انھوں نے مجھے اچھے سے کپڑے پہنائے اور ایک مولوی صاحب نے آ کر میرا نکاح اسی آدمی سے پڑھوا دیا جو مجھے لے کر آیا تھا۔ پتہ نہیں خالہ باجی نے گھر جا کر میرے بارے میں کیا کہا ہوگا؟ صمد اور چھوٹی کا کیا ہوا ہوگا؟ کیسے ہوں گے وہ؟ اکثر دادی انہیں یاد کر کے رویا کرتی تھیں۔

''اوہ اف اتنا ظلم'' عامر کی آواز میں درد ابھر آیا تھا۔

''لیکن یہ اس دستک سے ان کا کیا تعلق ہے۔''

میں نے بتایا نا عامر دادی کبھی اپنا گھر، ابا، بھائی بہن کسی کو نہیں بھول پائی تھیں وہ تو اس شہر کی تہذیب کو بھی نہیں بھولی تھیں جہاں سے ان کا خمیر اٹھا تھا جو داستانوں کا شہر تھا۔ پتہ ہے عامر وہ بہت اچھی داستان گو بھی تھیں رات کو بڑے چھوٹے، بچے، بیٹے، بہوئیں سب ان کے ارد گرد جمع ہو جایا کرتے تھے اور دادی سے داستان سنا کرتے تھے ایک کہانی تو مجھے ابھی تک یاد ہے چاندنی کی داستان۔ چاندنی جو ایک شہزادی تھی جسے ایک دیونی نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور ایک جادوئی قلعے میں ایک اونچے مینار میں چھپا رکھا تھا جہاں تک کوئی پہنچ نہ پاتا تھا دیونی دن بھر سوتی اور رات کو کہیں چلی جاتی تھی صبح جب آتی تو آواز دیتی۔

''چاندنی او چاندنی بال کھول نیچے لٹکا تو میں اوپر آؤں۔''

تب چاندنی جھروکے میں آتی اپنے بال نیچے لٹکاتی اور دیونی انہیں پکڑ کر اوپر چڑھ جاتی۔ ایک مرتبہ ایک شہزادہ شکار کے پیچھے بھٹکتا اس طرف نکل آیا رات ہو چلی تھی ایک پیڑ کے نیچے تھک کر سو گیا صبح دیونی کی آواز پر اس کی نیند کھلی اس نے یہ منظر دیکھا اور چاندنی کو جو دیکھا تو اس کے حسن پر دل و جان سے فدا ہو گیا اور وہیں جنگل میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گیا اگلی رات جیسے ہی دیونی قلعے سے باہر گئی اس نے آواز دی۔ ''چاندنی او چاندنی بال کھول نیچے لٹکا تو میں اوپر آؤں۔''

چاندنی نے شہزادے کو دیکھا جلدی سے بال کھولے اور اسے اوپر بلا لیا تب چاندنی نے اسے بتایا کہ دیونی کی جان کالی پہاڑی پر رہنے والی مینا میں ہے۔ شہزادے نے اس سے وعدہ کیا آزاد کرانے کا اور واپس لوٹ کر مینا کو ختم کر کے شہزادی کو رہا کرا لیا۔ جب بھی وہ یہ داستان سناتی تھیں بہت اداس ہو جایا کرتی تھیں کیونکہ ان کا شہزادہ تو رہائی کروا نہیں پایا تھا بلکہ دیونی کے انجان قلعہ میں وہ پھنس کر رہ گئی تھیں۔'' ''لیکن شاید تو بتاؤ کہ دادی نے تم سے ابھی ایسا کیا کہا جو تم ایسے رو رہی تھیں'' عامر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بیتابی سے پوچھا:

عامر دادی کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں ان کے ظالم شوہر کا انتقال جب ہوا تب سب بچے چھوٹے چھوٹے تھے بڑی مشقتوں سے دادی نے انہیں پالا مگر وہ سب اپنے باپ کا ہی خون نکلے وہ کہتے ہیں نا کہ سانپ کی اولاد سانپ ہی ہوتی ہے بس یہی سمجھو کسی نے کبھی دادی کے درد کو نہیں سمجھا، ان کی تڑپ پر دھیان نہیں دیا سب اپنی اپنی دنیا میں ایسے مگن ہوئے کہ دادی کو تو جیسے بھول ہی گئے کہ اس ماں کی ایک ہی تو خواہش رہی زندگی بھر کہ کوئی انہیں ان کے وطن ایک بار لے جائے۔ کئی بار وہ بیٹوں اور بیٹیوں سے خوشامد بھرے لہجے میں کہا کرتی تھیں مگر پتھر دل اولادوں کا دل کبھی نہیں پگھلتا تھا دادی ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتیں۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ ان

کے بیٹے غریب تھے تین بیٹے جو بمبئی میں تھے خاصے پیسے والے تھے مگر بس بے حس تھے وہ غریب الوطن اپنے وطن کے لیے تڑپتی رہ گئیں۔ حد تو اس وقت ہوئی جب ان کی ایک پوتی کا رشتہ دادی کے وطن میں ہوا۔ تب وہ بہت پر امید ہوگئی تھیں کہ اب تو وہ اپنے گھر جا سکیں گی۔ کیسا ہوتا ہے نا بیٹی کا اپنے گھر سے ناطہ وہ چاہے بوڑھی ہو جائے مگر اپنے مائیکہ کی چاہ نہیں چھوٹتی اور دادی تو غریب الدیار تھیں لیکن قسمت کی ستم ظریفی ہی کہیے کہ لڑکے والوں نے شادی بمبئی آ کر کر دی اور سفاک بیٹے نے دادی سے کہہ دیا کہ اب ہمیں وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے وہ خاموش نم آنکھوں سے اپنے کمرے میں لوٹ آئی تھیں۔ دادی بہت مایوس ہوگئیں ان کی اس وقت جو امید ختم ہوئی آس جو ٹوٹی اس نے انہیں اندر سے بکھیر کر رکھ دیا اس کے بعد دادی کبھی سنبھل نہیں پائیں پھر ان کو کسی نے ہنستے نہیں دیکھا اور ایک رات وہ خاموشی سے اپنے گھر جانے کا ارمان لیے اس دنیا سے ہی رخصت ہوگئیں۔ یہ ہے ان کی کہانی۔

''تمہارے ابا بھی تو تھے ان کے بیٹے ہی کی طرح وہ کیوں نہیں لے گئے انہیں ان کے وطن۔''

''ہاں عامر میرے ابا پر بھی ان کا پورا حق تھا مگر قسمت کی ستم ظریفی نے تو دادی کے دامن کو کچھ ایسا مضبوطی سے پکڑ لیا تھا نا کوئی کیا کرتا۔ پہلے تو ہمارے گھر کی غربت، دوسری ابا کے ایکسیڈنٹ نے انہیں مفلوج ہی کر دیا تھا وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے، اور پھر اسی حالت میں ان کا انتقال ہی ہوگیا۔ عامر دادی کی بیقرار روح کو آج تک قرار نہیں ملا ہے عامر وہ آج بھی تڑپ رہی ہیں اپنے گھر اور بھائی بہن کے لیے چلو ہم انہیں ڈھونڈتے ہیں۔''

''مگر کیسے اتنا بڑا شہر کیسے تلاش کریں گے کوئی اتہ نہ پتہ؟''

عامر، وہ بتاتی تھیں کہ ان کا گھر امام باڑے کے عقب میں ہی کہیں تھا اور ہم اس دن حسین آباد کے پیچھے ہی تو گئے تھے۔ عامر اس دن وہ شخص جو مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اس کی شکل دادی جیسی ہی تو تھی۔۔ ثنا، یاد کر کے ایکدم چیخ پڑی اس کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے جیسے کوئی کنارہ مل گیا ہو۔'' اور تم نے بھی تو بتایا کہ تم میں بھی دادی کی شباہت ہے۔''

رات بیت چکی تھی، صبح نمودار ہو چلی تھی اور پھر وہ دونوں چل پڑے ایک ادھوری کہانی کو مکمل کرنے کے لیے یہ جانتے ہوئے کہ اس جہان میں کوئی بھی کہانی مکمل نہیں ہوتی۔

○○

غزل

صبیحہ سنبل

یہ وحشت یہ جنوں یہ چاک دامانی مجھے دے دو
تم اپنی زندگی کی ہر پریشانی مجھے دے دو

سجا لو زندگی کا ہر حسیں منظر نگاہوں میں
ان آنکھوں کی اداسی اور ویرانی مجھے دے دو

وہ آہیں ہوں کہ آنسو درد و غم ہو یا خلش کوئی
بلائیں سب ہیں میری جانی پہچانی مجھے دے دو

تمھاری آنکھ میں آنسو مجھے اچھے نہیں لگتے
ہنسی لے لو مری یہ اشک افشانی مجھے دے دو

نہ لاؤ میل ہلکا سا بھی تم آئینۂ دل میں
لگے جو شے بھی ان آنکھوں کو بیگانی مجھے دے دو

سنا ہے دل کے ہاتھوں سیکڑوں برباد ہوتے ہیں
کہا مانو مرا یہ دشمن جانی مجھے دے دو

پشیماں حشر میں سنبل تمھیں کس طرح دیکھے گی
یہ بہتر ہے یہیں اپنی پشیمانی مجھے دے دو

دل کی گلیاں

روبینہ ساگر روبی

وہ اک یاد کہ ہر لمحہ ذہن میں جاگی
وہ اک ذکر کہ لہجہ بھی ہم بدل نہ سکے
وہ اک نام کہ جس نام کو بھولے نہ کبھی
وہ اک راہ کہ جس راہ سے ہم نکل نہ سکے
وہ اک زخم کہ ہر لمحہ تازہ تازہ رہا
وہ اک درد کہ جس سے کبھی سنبھل نہ سکے

سرمئی پہاڑوں پر شام اپنا گلابی آنچل پھیلا چکی تھی۔ پرندوں کے غول کے غول آسمان میں اڑتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ دیر قبل ہونے والی زوروں کی بارش اب ختم ہو چکی تھی۔ جس کے بعد پیڑ، پودے اور درخت نکھرے ستھرے جھوم رہے تھے۔ مٹی کی سوندھی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

اپنے گھر کے لان میں لگے آم کے بڑے سے درخت کے نیچے بینچ پر بیٹھے پروفیسر ارحم فاتح آفندی کی نگاہیں ابھی بھی اس کوئل پر جمی تھیں جو اپنا مدھر راگ الاپ کر خاموش ہو گئی تھی۔ یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی جہاں بیٹھ کر اسے عجیب سکون ملتا تھا اور اسی جگہ بیٹھ کر وہ ڈائری لکھتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ڈائری لکھنے میں گم تھا۔ بلیک کور والی خوبصورت ڈائری اس کے تمام رازوں کی امین تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ڈائری کے اوراق میں گم ہونے لگے۔ آم کے درخت سے بارش کی بوندیں اب بھی ٹپاٹپ گر رہی تھیں۔

شمع کی لو تھی کہ وہ تو تھا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے
لٹ کے بھی خوش ہوں کہ اشکوں سے بھرا ہے دامن
دیکھ غارت گر دل یہ بھی خزانے میرے

دنیا اسے پروفیسر ارحم فاتح آفندی کے نام سے جانتی تھی۔ وہ جو کبھی اپنے اسٹوڈنٹ کا چہیتا ہوا کرتا تھا۔ اب وہی اسٹوڈنٹ اسے تمسخر بھری نگاہوں سے دیکھ کر ہنسا کرتے تھے۔ وہ جس کے ہونٹوں پہ کبھی ہر دم مسکراہٹ رینگتی تھی۔ جس نے اداس رہنا کبھی سیکھا ہی نہ تھا۔ اب وہی لب چاہنے کے باوجود بھی نہیں مسکراتے تھے۔ اس کے دل کی گلیاں آباد ہونے سے پہلے ہی ویران ہو گئی تھیں۔ اس کے دل کے چمن میں پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئے تھے اور اب اس کا دل کھنڈرات بن چکا تھا۔ جہاں صرف کسی کی یادیں رقص کرتی تھیں۔

جزا ایام آفندی کب سے ریلنگ سے ٹیک لگائے نیچے لان میں بیٹھے ارحم کو دیکھ رہی تھی۔ جو بینچ پر بیٹھا اپنے ہاتھوں میں ڈائری پکڑے آنکھیں موندیں کسی گہری سوچ میں گم تھا اور پاس ہی اس کی اسٹک (بیساکھی) رکھی ہوئی تھی۔ جزا نے ایک نظر اپنے ہاتھ پر ڈالی جس میں ارحم فاتح کے نام کی انگیجمنٹ ریڈ ڈائمنڈ سے مزین جگمگ کرتی انگوٹھی لشکارے مار رہی تھی۔ کچھ یاد کر کے اس کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ اسے وہ دن بھی یاد تھا جس دن اس کا برتھ ڈے تھا۔ ٹھیک بارہ بجے ارحم کی طرف سے اُسے موبائل پر میسج موصول ہوا تھا۔ وہ میسج پڑھنے لگی۔

جان حیات کے نام۔

میں نے جس لمحے کو چاہا ہے اُسے بس ایک بار خواب بن کر تیری آنکھوں میں اُترتا دیکھوں تو میرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جان حیات جانے کیوں دل کو تیرے لیے دھڑکتا دیکھوں۔

وہ اسے اس نام سے ہی مخاطب کرتا تھا۔ میسج پڑھ کر اس کے لب دلکشی سے مسکرا دیے۔ محبت کا اتنا خوبصورت اور بھرپور انداز اس کے دل میں ڈھیروں کلیاں کھلا گیا۔ اسے بھی اپنے اس کزن سے بے تحاشا محبت تھی۔ خوبرو سا ارحم لاکھوں لڑکیوں کے دل کی دھڑکن تھا، لیکن اس کے دل کے آنگن میں صرف جزا ایام آفندی کا قبضہ تھا۔ کھلتی ہوئی گندمی رنگت اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی جزا ارحم کے دل کے چمن کا پھول تھی۔

اور پھر دوسرے دن ارحم نے اسے گولڈ کا لاکٹ گفٹ کیا تھا۔ جس

پر ''جان حیات'' لکھا ہوا تھا۔ جزا نے اسے اپنے گلے میں پہن لیا تھا۔

ارحم نے اس سے کہا تھا۔

''جانتی ہو جزا میں نے تمھیں یہ لاکٹ کیوں دیا۔''

''کیوں'' وہ پوچھ رہی تھی۔

اگر زندگی میں میں تم سے کسی موڑ پر بچھڑ گیا تو یہ لاکٹ تمھیں میری یاد دلائے گا۔ اسے ہمیشہ اپنے گلے میں پہنے رکھنا۔'' وہ ہنس کر کہتا۔

اور وہ جدائی کے ڈر سے ہی دہل اٹھتی۔

''اللہ نہ کرے ارحم ہم کبھی جدا ہوں اور وہ ہنس ہنس کر آمین کہتا اور جزا مارنے کے لیے اس کے پیچھے پورے گھر میں دوڑی پھرتی۔ ارحم اس کا کزن ہونے کے ساتھ ساتھ منگیتر بھی تھا۔ ایک سال پہلے ہی بڑوں کی رضامندی سے ان کی منگنی ہوئی تھی۔

مغرب کی اذاں ہو رہی تھی۔ اُفق پر دھیرے دھیرے سورج کی لالی پھیلتی جا رہی تھی۔ دور بہت دور آسمان میں طوطے شور مچاتے ہوئے تیزی سے اُڑتے چلے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دھن میں وہ آسمان کی بلندیوں میں کھوتے جا رہے تھے۔ یوں جیسے آسمان کو چھو لینا چاہتے ہوں۔

پنک اینڈ گرین ڈریس میں ملبوس جزا ہاتھ میں ریڈ روز لیے آنکھیں موندیں اس کی بھینی بھینی خوشبو کو اپنی سانسوں میں اُتار رہی تھی۔ اسے گلاب بہت پسند تھا۔

تبھی ارحم کالج سے لوٹا تھا۔ بلیک جینز اور بلیک ہی شرٹ میں ملبوس وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں آنکھیں موندیں جزا پر تھیں۔ وہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''جزا تم نے اس پھول کو ڈال سے جدا کر کے اچھا نہیں کیا۔'' ارحم کی آواز پہ وہ اُچھلی تھی۔ وہ اسے پھول توڑنے ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ ہٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

اب دیکھو یہ خوبصورت پھول مرجھا جائے گا۔ جان حیات، مجھے یہ معصوم سے پھول ڈال پر ہی اچھے لگتے ہیں ہنستے مسکراتے ہوئے، مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے جب کوئی ان نازک سے پھولوں کو بے دردی سے توڑ کر پھینک دیتا ہے۔ آئندہ پلیز پھول مت توڑنا۔ وہ بہت حساس دل تھا۔

''سوری ارحم اب میں کبھی پھول نہیں توڑوں گی آپ ٹھیک کہتے ہو۔'' وہ شرمندہ سی کہہ رہی تھی۔

''اور پلیز اب اپنا لیکچر بند کر دو پروفیسر صاحب ابھی کالج سے لیکچر جھاڑ کر آ رہے ہو اور آتے ہی یہاں بھی شروع ہو گئے۔'' وہ منہ پھلا کر کہنے لگی تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔

''یار ناراض تو مت ہوا کرو، دیکھو میں تمھارے لیے کیا لایا ہوں'' اس نے ایک پیکٹ اس کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے اس میں۔''

''خود ہی کھول کر دیکھ لو۔''

اور جب اس نے پیکٹ کھولا تو اس میں ڈھیر ساری رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں تھیں۔

''اجازت ہو تو پہنا دوں۔''

اور جواب میں اس نے اپنی دونوں کلائیاں اس کے سامنے کر دی تھیں۔

اور پھر ارحم کی زندگی میں ایک بھیانک حادثہ ہو گیا جو اس کی زندگی میں سیاہی بھرتا چلا گیا۔ سڑک حادثے میں اس کی ایک ٹانگ کٹ گئی تھی وہ سب سے کٹ کر رہ گیا تھا، اپنی تنہائیوں میں گم اپنی اداسیوں کے سنگ ڈائری کے اوراق سیاہ کرتے رہتا۔ ابھی تو وہ محبت کی بارش میں پوری طرح بھیگ بھی نہیں پایا تھا کہ غموں کی دھوپ نے اس پر سایہ کر دیا تھا۔

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا
وہ کہ خوشبو کی طرح پھیلا تھا میرے چار سو
میں اسے محسوس کر سکتا تھا چھو سکتا نہ تھا

موسم خاصا دلکش ہو رہا تھا۔ سیاہ بادل آسمان پر گھر آئے تھے۔ ٹھنڈی خوشگوار ہوائیں چل رہی تھیں۔ کیاریوں میں کھلے رنگ برنگے پھول مدہوش سے جھوم رہے تھے۔

گلاب کے کیاریوں کے پاس اسٹک کے سہارے کھڑے ارحم اپنے سے کچھ فاصلے پر بیٹھی جزا کو بغور تکے جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ بلیک کلر کے لانگ شرٹ اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس اپنے سامنے کتابیں پھیلائے وہ کب سے ارحم کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس سے ٹیوشن پڑھتی تھی، لیکن کچھ دنوں سے ارحم اسے پڑھانے ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ اسے پڑھانے سے انکار کر چکا تھا، لیکن پھر بھی وہ کسی ڈھیٹ کی طرح یہاں آ کر بیٹھ رہی تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا اسٹک کے سہارے چلتا ہوا جزا کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس کو دیکھ کر مسکرا دی۔ ارحم نے کوئی ریسپانس

نہیں دیا تھا اور نظریں کتاب پر لگا دی تھیں۔

''تم آج پھر پڑھنے آ گئی ہو میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اب میں تمھیں پڑھانا نہیں چاہتا۔'' وہ پھنکارا تھا۔ ''لیکن کیوں۔''

''کیونکہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

''آپ کے پاس سب کے لیے وقت ہے ایک میرے لیے ہی وقت نہیں، کیا ہو گیا ہے آپ کو ارحم آپ پہلے تو ایسے نہیں تھے۔''

''ہاں نہیں تھا میں پہلے ایسا کیونکہ تب میں مکمل تھا اور اب ادھورا ہوں۔'' اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ جو اس نے جزا کے حوالے سے دیکھے تھے، زندگی بے رنگ ہو گئی تھی۔ ''جان حیات میں آج بھی تم سے کہتا ہوں کہ تم میرا پیچھا چھوڑ دو میں تم سے کوئی بھی رشتہ برقرار رکھنا نہیں چاہتا ہوں۔ تم کسی اچھے سے لڑکے سے شادی کر لینا۔ میری ادھوری ذات تمھیں کچھ بھی نہیں دے گی۔'' وہ جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''پلیز ارحم اب ایک لفظ بھی مت کہنا۔'' وہ آنسو بھری آنکھوں سے شکوہ کر رہی تھی۔

''ایک بات پوچھوں ارحم۔''

''ہاں پوچھو۔'' وہ افسردہ سا مسکرا دیا۔

''اگر ہماری شادی کے بعد آپ کے ساتھ یہ حادثہ ہو جاتا تو کیا آپ مجھے چھوڑ دیتے۔'' وہ بہت آس سے پوچھ رہی تھی۔

''نہیں جب کی بات الگ ہوتی۔'' وہ سرعت سے بولا۔

''جب کی اور اب کی بات میں کوئی فرق نہیں ہے ارحم میں اب بھی آپ کی ہمراہی میں قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہتی ہوں اور مجھے اپنے اس فیصلے سے کوئی نہیں روک سکتا اور آپ بھی نہیں سنا آپ نے۔'' وہ مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے بھیگی آنکھوں سے مسکرا دی۔

''لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا میں نہیں چاہتا کہ لوگ ہمیں ترحم بھری نظروں سے دیکھیں، ہم پر طنز کریں اور ذرا سوچو تو جزا تم مجھ لنگڑے کے ساتھ چلتی ہوئی کیسی لگو گی۔ لوگ ہمارے اس بے جوڑ پھیکیل پر ہنسیں گے اور پھر تم میں کیا کمی ہے۔''

وہ بولتے بولتے تھک سا گیا تھا۔

''مجھے بھول جاؤ جان حیات۔''

کتنی آسانی سے کہہ دیا آپ نے کہ میں آپ کو بھول جاؤں واہ ارحم واہ اگر بھولنا اتنا آسان ہوتا تو میں آج آپ کے سامنے محبت کی بھیک نہیں مانگ رہی ہوتی۔ اتنے سنگ دل مت ہو ارحم مجھے آپ کی ذات سے کچھ نہیں چاہیے۔ بس آپ کی محبت چاہیے اور ویسے بھی میری چاہتیں بے غرض ہیں۔ خود غرض نہیں اور بے غرض چاہتیں صلے کی توقع نہیں رکھتیں یہ صرف دینا جانتی ہیں۔ لینا نہیں مجھے بھی آپ کی خوشی مقدم ہے۔ میں آپ کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں کچھ بھی۔ آپ چاہتے ہیں میں آپ سے منگنی توڑ دوں تو ٹھیک ہے۔ یہ لو اپنی پہنائی ہوئی انگوٹھی۔'' اس نے انگوٹھی اپنی انگلی میں سے اُتار کر ارحم کے ہاتھ میں تھما دی۔ ''اور میری ایک اور خواہش پوری کر دو جزا تمھارے لیے جو انگلینڈ سے رشتہ آیا ہے اس کے لیے ہاں کہہ دو، میں تمھیں بہت خوش دیکھنا چاہتا ہوں تم اتنا خوش رہو اتنا خوش رہو کہ تمھارا دامن خوشیاں سمیٹتے سمیٹتے تنگ پڑ جائے۔'' کہتے کہتے ارحم کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ یکا یک ہی بارش کی موٹی موٹی بوندیں آسمان سے ٹپکنے لگی تھیں تیز ہوا کا شور بڑھ گیا تھا۔ ارحم کی امی اور جزا کی امی (ارحم کی چچی) ان دونوں کو آوازیں دے رہی تھیں جو دنیا و مافیہا سے بے خبر بارش کی بوچھار میں بھیگ رہے تھے اور ساتھ ساتھ ان دونوں کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں جیسے سارے درد سارے غم دونوں آج ہی اس بارش میں بہا دینا چاہتے ہوں۔ ان دونوں کی حالت اس مسافر کی طرح ہو رہی تھی جو ساری دنیا گھوم آیا ہوں لیکن پھر بھی اسے اس کی منزل نہ ملے۔

پھر وہ اپنے بابل کا آنگن چھوڑ کر اپنے سسرال انگلینڈ چلی گئی تھی۔ رخصتی سے پہلے وہ چاہتے چاہتے ارحم سے آخری بار ملنے اس کے کمرے میں آئی تھی۔ وہ کھڑکی کے پٹ کھولے اسٹک کے سہارے کھڑا آسمان کی وسعتوں میں کچھ کھوج رہا تھا۔ شدت گریہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''ارحم'' جزا کی کپکپاتی آواز پر وہ پلٹا تھا اور پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ آ گئی تھی۔ اس کی جان حیات کسی اور کی دلہن بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ اسے اُداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کچھ کہو گے نہیں ارحم۔''

''ارے آج تو تم بہت حسین لگ رہی ہو یار آج سے پہلے تو تم مجھے اتنی خوبصورت کبھی نہیں لگی۔ ضرور یہ میک اپ کا کمال ہے۔'' وہ کھو کھلے لہجے میں کہتے ہوئے ہنس دیا اس کے لب اس کی ہنسی کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ جزا خوب جانتی تھی۔ کیونکہ اپنے دل پر بھی وہ قیامت سہہ رہی تھی۔ ''کیوں اپنے آپ کو بہلا رہے ہو ارحم۔ میں آپ سے بس اتنا ہی کہوں گی۔ ہو سکے تو مجھے بھول جانا اور کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لینا۔''

''تمھیں بھلانا میرے اختیار میں نہیں جزا، میری زندگی تمھاری یاد کے سہارے ہی کٹ جائے گی۔'' درد بھری مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا تھا۔

''اچھا جان حیات یہ تو بتاؤ تم انگلینڈ جا کر ہم سب کو بھول تو نہیں جاؤ گی نہ اور پھر ہم سے ملنے کب آؤ گی۔'' وہ بڑی آس سے پوچھ رہا تھا۔

''یہ ہماری آخری ملاقات ہے ارحم، میں آپ لوگوں سے اب کبھی ملنے نہیں آؤں گی، اب آپ میری شکل دیکھنے کو بھی ترس جاؤ گے۔ جو ظلم آپ نے میرے اور اپنے اوپر کیا ہے اب اس کی یہی سزا ہوگی۔ اس گھر میں ہماری بہت ساری یادیں بکھری پڑی ہیں۔ میں اب اور دُکھ برداشت نہیں کر سکتی ارحم۔ اب میرا دل بھی تنہا ہو گیا ہے۔ میرے دل کی گلیاں آپ سے آباد تھیں اور اب یہ سنسان ویران ہو گئی ہیں اور تا عمر ویران ہی رہیں گی۔ میں نے اپنے دل کے دروازے آپ کے لیے کھولے تھے ارحم اور یہ دل اب آپ کی یادوں سے ہی آباد رہے گا اور میرے جینے کے لیے آپ کی یادیں ہی کافی ہوں گی اور اب آپ کے بعد میں نے اپنے دل کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ اب اس میں کوئی داخل نہیں ہو سکے گا۔

''خدا حافظ ارحم اب چلتی ہوں اپنا بہت خیال رکھنا۔''

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔

رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ درخت پیڑ پودے اندھیرے کے باعث خوفناک دکھائی دے رہے تھے۔ وہ لان میں بیٹھا اُداس چاند کو تکے جا رہا تھا۔ آج چاند بہت اُداس تھا یا پھر اسے لگ رہا تھا۔

***

غزل

نسیم نیازی

ذرا ذرا بھی سجا ہوا سا لگتا ہے
ترے خلوص کا مارا ہوا سا لگتا ہے

وہ ایک شخص جو سب سے خفا سا لگتا ہے
نہ جانے کیوں مرے جی کو بھلا سا لگتا ہے

اب اس مقام پہ تیرا مریضِ غم ہے جہاں
مزاج پوچھنے والا بُرا سا لگتا ہے

رہِ وفا میں کسے ہمسفر بنا کے چلیں
یہاں ہر ایک مسافر تھکا سا لگتا ہے

یہ کون آ کے پڑا ہے تمھارے کوچے میں
جہان بھر کا ستایا ہوا سا لگتا ہے

عجب ہے اس کی طبیعت عجب ہے اس کا مزاج
وہ بے وفا تو نہیں بے وفا سا لگتا ہے

جو دیکھنا ہو اسے دیکھ لو ان آنکھوں میں
وہ رنگ و نور کا پیکر خدا سا لگتا ہے

ہمیں خبر نہ ہوئی کب بہار آئی نسیم
شجر کو دیکھ رہی ہوں ہرا سا لگتا ہے

غزلیں

بلقیس ظفیر الحسن

پیروں تلے زمیں ہے نہ ہے سر پہ آسماں
پھرتے ہیں ہم خلاؤں میں بے سمت، بے اماں

ہم جیسے سوختہ جگر آتش بجان لوگ
پھولوں کی طرح کھلتے ہیں شعلوں کے درمیاں

تھا حوصلہ بلند ، مگر کیسے جیتتے
بے آب تیغ اپنی تھی ، ٹوٹی ہوئی کماں

شہ رگ سے بھی قریب دھڑکتا ملا ہے وہ
اور جستجو میں اس کی پھرے ہم کہاں کہاں

ہے میری کائنات مرا گھر، نہ جاؤں میں
مل جائے عرش سے بھی پرے گر کوئی مکاں

بلقیس چپ تو یوں نہ رہو کچھ بتاؤ تو
کس مخمصے میں ڈال دیا خود کو جانِ جاں!

نفرت کھڑی تھی بام پہ در پہ نفاق تھا
قصرِ وفا میں مار سیہ طاق طاق تھا

ہیں حسرتوں کے کشتوں کے پشتے لگے ہوئے
یہ شہرِ آرزو بھی مرا کیا عراق تھا

ہاں مصلحت شناس نہیں تھا وہ نامراد
یوں اپنے فن میں کہتے ہیں وہ شخص طاق تھا

راہوں کے پیچ و خم میں فراموش سب ہوا
کس کی طلب تھی کس کا ہمیں اشتیاق تھا

دن رات بے کلی سے چلو جان تو چھٹی
جینا ترے بغیر بہت دل پہ شاق تھا

حسن سخن

کہکشاں تبسم

غزلیں

ست رنگے دھنک سپنے آنکھوں میں سجا رکھوں
یادوں کا شجر دل میں سرسبز سدا رکھوں

پھر شام ڈھلی سائے پیڑوں کے ہوئے بوجھل
پھر برگ مژہ جگنو یادوں کے جلا رکھوں

آسیب زدہ راتیں، در بند، دریچے گم
وہ وقت کہاں جاناں چوکھٹ پہ دیا رکھوں

یہ دشت طلب مجھ کو سوغات بھی کیا دے گا
اے گرد مسافت! کیا چھالوں کے سوا رکھوں

گنجان درختوں کے موسم بھی بدلتے ہیں
پھر دل کا شجر کیسے ہر لمحہ ہرا رکھوں

دو پل ہی سہی آؤ دکھ سکھ کی کریں باتیں
فرصت ہے تبسم یا کل پہ اٹھا رکھوں

■■■

وہ ایک ساعت گمان جیسی
لہو میں اتری کمان جیسی

کہیں تو ٹھہریں گے پاؤں اپنے
کوئی صدا ہو اذان جیسی

کھلا ہے باب سکوت کیسا
خموشیاں ہیں بیان جیسی

خود اپنی حدت میں ہے دھواں سی
زمیں بھی اب آسمان جیسی

تمام رشتے ببول جیسے
یہ دھوپ نا مہربان جیسی

مرے لہو میں پنپنے والی
نمو کی قوت اڑان جیسی

سفر میں رہ رہ کے کام آئی
کوئی دعا سائبان جیسی

وہ خود پسندی کے زعم میں گم
مری بھی فطرت کمان جیسی

سنبھال پائیں گے خود کو کیسے
یہ رہ گزر ہے ڈھلان جیسی

وہ پھول اجلی رفاقتوں کے
وہ خوشبوئیں مہربان جیسی

لبوں پہ چپ جم گئی تبسم
ہیں ساعتیں بے زبان جیسی

بارہ آنکھوں میں افسانے

پروین شیر

جب جب اپنی بارہ آنکھیں
اک اک کر کے وا کرتا ہے
نئی کہانی وہ کہتا ہے
کئی سمندر
اس کی آنکھوں میں پنہاں ہیں
جن کی سب موجوں پہ نوشتہ
زیست کے سارے افسانے ہیں
ماضی، حال و مستقبل کی
گاتی لہریں
طغیانی کی گہری چیخیں
دیواروں کا اٹھنا، گرنا
سانسوں کا آنا، رک جانا
چاند کے پتھر چھو لینا اور
تازہ پھولوں کو شعلوں کی
ہیئت دینا
کتنے پیکر غرق ہوئے ہیں
کتنے بیڑے پار گئے ہیں
کتنے سفینے گردابوں میں
چکر کھا کر بکھر گئے ہیں
کلکاری اور آہوں کی گڈمڈ آوازیں
آتی جاتی رہتی ہیں اس
کمرے کی دیوار کو تھامے
میری آنکھیں جب تکتا ہے
کتنے افسانے کہتا ہے......!

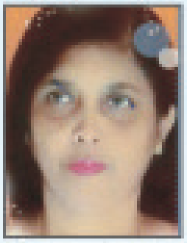

سلمیٰ صنم

غزل

عبادت ایسے انساں کر رہا ہے
کہیں پر دل، کہیں پر سر رہا ہے

نرالا ہے بڑا انداز اس کا
مرے سائے پہ وہ — کر رہا ہے

قفس میں رہنے والا ہر پرندہ
اڑانیں بھرنے سے اب ڈر رہا ہے

یہ کیسی زندگی ہے، اندر اندر
ہراک انسان ہر پل مر رہا ہے

یہ تم ہی ہو کہ کوئی اور تم سا
محبت میں جو آہیں بھر رہا ہے

•••

گرمیوں سے راحت دینے والے مشروبات وحلوے

اورنج جیم

اجزاء: نارنگیاں 4 عدد (بڑی اور باریک چھلکے والی)، چینی 2 کپ، پانی ایک کپ، سرخ مرچ دو عدد (بیج نکال دیں اور باریک پیس لیں)

ترکیب: نارنگیوں کو اچھی طرح دھو کر ان کے دو حصے کریں اور چمچے کی مدد سے گودا نکال کر رکھ لیں جبکہ بیج پھینک دیں۔ نارنگیوں کے چھلکے صاف کر کے باریک باریک کاٹ کر ایک طرف رکھ لیں۔ اب گودے کو کانٹے کی مدد سے اچھی طرح مسل لیں اور اسے جوس سمیت ایک پیالے میں ڈالیں۔ پھر ایک بھاری پیندے والی سوس پین یا پتیلی میں تمام گودا، جوس، چھلکے، پسی ہوئی سرخ مرچ، چینی اور پانی ایک ساتھ شامل کر کے پکائیں۔ درمیانی آنچ پر تقریباً 15 سے 20 منٹ تک چولہے پر رکھیں اور اس دوران مسلسل چمچہ چلاتی رہیں، یہاں تک کہ آمیزہ قدرے گاڑھا ہو جائے۔ اس کے بعد چولہے سے اتار کر ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر شیشے کے صاف اور خشک جار میں بھر لیں اور رات بھر کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ گھر کا بنا ہوا منفرد ذائقے والا یہ اورنج جیم بچوں اور بڑوں سب کو پسند آئے گا۔ ڈبل روٹی اور پراٹھے پر لگا کر کھائیں۔ ناشتے کی میز پر یہ اچھا اضافہ ثابت ہوگا۔ اگر چاہیں تو نارنگیوں کے بجائے اعلیٰ کوالٹی کے تازہ کنو سے بھی یہ جیم تیار کر سکتی ہیں۔

کولڈ کافی

اجزاء: کافی 4 کھانے کے چمچے، پانی 2 کھانے کے چمچے، دودھ آدھا لیٹر، آئس کریم 4 اسکوپس (ونیلا)، چینی حسب ذائقہ، برف 8-9 عدد (کیوبز)

ترکیب: سب سے پہلے 2 کھانے کے چمچ گرم پانی میں کافی کو مکس کر لیں پھر بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کریں پھر دودھ، چینی، برف بھی شامل کر کے بلینڈ کریں۔ پھر لمبے اور خوبصورت گلاس میں آئس کریم ڈال کر اوپر سے بلینڈ کی ہوئی کولڈ کافی ڈال دیں۔ مزیدار کولڈ کافی تیار ہے۔

جوسی فروٹ چاٹ

کیلے چھ عدد، امرود دو عدد، پپیتا آدھا کلو، انگور ایک پاؤ، خربوزہ آدھا لو، فریش اورنج جوس ایک گلاس، لیموں دو عدد، کالی مرچ ایک چمچ، چینی دو چمچ

ترکیب: رس ڈال دیں اور پھر تمام فروٹ کو چھوٹے چھوٹے

ٹکڑوں میں کاٹ کر اس میں ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں اور کالی مرچ اور چینی ملا لیں۔ مزیدار جوسی فروٹ چاٹ تیار ہے۔ تھوڑی دیر تک فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیں۔

گاجر کا حلوہ

اجزاء: گاجر ایک کلو، چینی ایک پیالی، چھوٹی الائچی تین سے چار عدد، گھی ایک پیالی، دودھ دو پیالی، بادام سجانے کے لیے۔

ترکیب: ایک بڑے نان اسٹک پین میں کدوکش کی ہوئی گاجر اور دودھ ڈال کر گلا لیں۔ جب گاجر گل جائے اور دودھ خشک ہو جائے تو اس میں گھی، چینی اور الائچی شامل کر کے اچھی طرح بھون لیں۔ یہاں تک کہ گھی اوپر آ جائے، اب اس تیار حلوے کو کسی خوبصورت سرونگ ڈش میں نکال کر بادام سے گارنش کریں۔ مزیدار گاجر کا حلوہ تیار ہے۔

شیر خرما

اجزاء: دودھ ایک لیٹر۔ سویاں ایک کپ۔ چھوٹی الائچی چھ عدد۔ چھوہارے 6 عدد۔ پستے حسب ضرورت۔ بادام حسب ضرورت۔ چینی دو کپ۔ کنڈینسڈ ملک، آدھا لیٹر۔ کیوڑہ ایسنس چند قطرے۔ کھویا حسب پسند۔ گھی دو کھانے کے چمچے۔

ترکیب: چھوہاروں کو رات بھر کے لیے بھگو دیں۔ صبح ان کی گٹھلیاں نکال کر لمبائی کے رخ پر چار حصوں میں کاٹ لیں۔ سویاں توڑ لیں۔ چھوٹی الائچیوں کو موٹا موٹا کوٹ لیں۔ بادام اور پستوں کو کاٹ لیں، تاہم بہت زیادہ باریک کاٹنے سے گریز کریں۔ دودھ بوائل کر کے ایک طرف رکھ دیں۔ اس تمام ابتدائی تیاری کے بعد سب سے پہلے ایک پتیلی میں گھی گرم کریں اور اس میں الائچیاں ڈال کر ذرا دیر کڑکڑائیں۔ پھر اس میں سویاں شامل کریں اور بھونیں۔ جب ہلکی براؤن ہو جائیں تو نکال کر ایک طرف رکھ لیں۔ اب اسی گھی میں چھوہارے اور بادام، پستے فرائی

کریں اور نکال کر رکھ لیں۔ اس کے بعد پتیلی کو نیچے اتار کر قدرے ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ پھر پتیلی دوبارہ چولہے پر رکھ کر اس میں دودھ شامل کریں اور جوش دیں، تاکہ یہ قدرے گاڑھا ہو جائے۔ پھر اس میں سویاں اور اس کے بعد چینی شامل کر کے پکائیں، یہاں تک کہ چینی اچھی طرح حل ہو جائے۔ اب اس میں تمام میوہ جات شامل کر کے ذرا دیر پکائیں۔ پھر کھویا اچھی طرح توڑ کر دودھ میں شامل کریں اور چلائیں۔ تاہم کھویا شامل کرنا ضروری نہیں بلکہ یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ اب چولہے سے اتار کر قدرے ٹھنڈا ہونے دیں اور پھر اس میں کنڈینسڈ ملک اور کیوڑہ ایسنس شامل کر کے چند منٹ کے لیے ڈھانپ دیں۔ مزیدار روایتی شیر خرما تیار ہے۔ خوبصورت سی ڈش میں نکال کر سرو کریں۔

بالوں کی خوبصورتی اور حفاظت

بالوں کی خوبصورتی اور حفاظت

بال عورت کے جسم کا اہم ترین حصہ ہیں اور یہ اس کی مجموعی خوبصورتی میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کچھ عورتیں لمبے بال پسند کرتی ہیں تو کچھ چھوٹے بال رکھنا پسند کرتی ہیں۔ کچھ خواتین کو گھنگھریالے بال بھاتے ہیں تو کچھ سلکی اور سیدھے بالوں کو ترجیح دیتی ہیں اسی طرح بعض خواتین کو ہر وقت بال کھلے رکھنا اچھا لگتا ہے اور بعض

انھیں سمیٹ کر چوٹی باندھے یا جوڑے میں لپیٹے رکھنا پسند کرتی ہیں مگر کچھ بھی ہو آپ نے کبھی ایسی عورت نہ دیکھی ہوگی جو اپنے بالوں سے محبت نہ کرتی ہو یا ان کی خوبصورتی میں مزید اضافے کی خواہش مند نہ ہو یہی وجہ ہے کہ جہاں کچھ خواتین اکٹھی ہوں، خصوصاً شادی بیاہ کی محفل ہو یا کوئی ایسی محفل ہو جہاں خواتین بج سنور کر بالوں کو نت نئے انداز سے سنوار کر آئی ہوں وہاں لڑکیوں اور اکثر و بیشتر بڑی عمر کی خواتین کی ٹولیوں میں بھی اسی موضوع پر بات ہوتی ہے کہ فلاں کے بال دیکھو کیسے جچ رہے ہیں یا تمھارے بال خوبصورت لگ رہے ہیں، آج کل کون سا شیمپو استعمال کر رہی ہو اسی طرح عمر رسیدہ خواتین کی بالوں سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لڑکی بالیوں کو اس حوالے سے ڈھیروں نصیحتیں کرتی نظر آتی ہیں کہ بال کھلے مت چھوڑو، کٹواؤ مت اور ان میں تیل لگاؤ وغیرہ۔ بالوں کی حفاظت کے لیے ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھیں

کہ آپ جو شیمپو یا ہیئر آئل استعمال کر رہی ہیں وہ آپ کے بالوں کی قسم سے مطابقت رکھتا ہو۔ مہینے میں ایک آدھ بار بالوں میں مہندی ضرور لگائیں اور مہندی میں ایک انڈا اور تھوڑا سا سرسوں کا تیل بھی شامل کر لیا جائے تو سونے پر سہاگے والی بات ہے۔ ہفتے میں ایک یا دو بار بالوں پر دہی میں سرسوں کا تیل ملا کر ضرور لگائیں۔ یہ آپ کے بالوں سے خشکی کا خاتمہ کرتا ہے اور انھیں نرم ملائم اور چمکدار بناتا ہے جبکہ دوسری طرف قدرتی ٹانک سے بالوں کی رنگت زیادہ سیاہ ہو جاتی ہے۔

داغ دھبوں سے پاک جلد

دھوپ، ناقص خوراک اور خراب صحت چہرے کی جلد کو متاثر کرنے کا سب سے اہم سبب ہیں، انسانی جلد حیرت انگیز حفاظتی ردعمل رکھتی ہے، جلد کی گہری اندرونی تہہ میں خلیے میلانین پیدا کرتے ہیں، جب ہم دھوپ میں آتے ہیں تو میلانین کی پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے، یہ عمل جب ایک دفعہ پیدا ہوتا ہے تو جلد کی بیرونی تہہ میں آ جاتا ہے اور اس سے

جلد پر دھبے پڑ جاتے ہیں، اس لیے جلد کو دھوپ سے بچانا چاہیے اور ایسی مصنوعات کا استعمال کرنا چاہیے جو جلد کو دھوپ کے اثرات سے محفوظ رکھ سکتی ہیں، اس سلسلے میں سن سکرین کا استعمال انتہائی مفید ثابت ہو سکتا ہے لیکن کسی بھی سن سکرین کریم کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ ان میں کیمیائی اجزاء کی تعداد زیادہ نہ ہو۔ حسن و خوبصورتی کے ماہرین کے مطابق جلد کی حفاظت قدرتی مصنوعات سے کی جائے تو وہ نہ صرف جلد کے دھبوں کو ختم کرتی ہیں بلکہ اسے اندر تک صحت مند بھی بناتی ہیں، جلد کے لیے صندل کی لکڑی پر مشتمل سن سکرین دھوپ سے تحفظ کے لیے مثالی ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔ جلد کی حفاظت کے لیے دوسرا اہم امر اس کی باقاعدگی سے کلینزنگ ہے۔

سن سکرین خریدتے وقت ایسے برانڈ کا انتخاب کریں جس میں گلیسرین اور لیموں کا رس بھی پایا جائے، لیموں کے رس پر مشتمل فیس ماسک لگانے سے بھی جلد کی تہہ میں چھپا سارا میل باہر نکل آتا ہے اور جلد تر و تازہ رہتی ہے۔ اسی طرح خراب صحت اور ناقص خوراک بھی چہرے کی جلد کو بے رونق بنا دیتی ہے، اس مقصد کے لیے اچھی خوراک کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ جلد کی قدرتی نمی جبکہ خون میں نمکیات اور وٹامنز کی مقدار برقرار رکھی جائے، پھل، کچی سبزیاں اور سلاد وغیرہ جلد کے لیے انتہائی مفید ہیں۔ دن میں کم از کم تین گلاس جوس جلد کے لیے بہت مفید ہے، گاجر، سیب یا مالٹے اور کنو وغیرہ کا جو جلد کو تر و تازہ اور صحت مند بنانے کے لیے ادویات اور میک اپ سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔

درست میک اپ چہرہ دلکش

میک اپ کا آغاز فاؤنڈیشن سے کیا جاتا ہے اور اسی پر پورے میک اپ کا انحصار ہوتا ہے۔ یاد رکھیں فاؤنڈیشن کا مقصد آپ کو گورا کرنا نہیں بلکہ یہ آپ کے چہرے کی قدرتی رنگت کو یکساں کرتا ہے اور داغ دھبوں کو چھپاتا ہے لہٰذا اپنی جلد اور رنگت کو مدنظر رکھ کر صحیح فاؤنڈیشن کا

انتخاب کریں۔ اگر آپ کی جلد خشک ہے تو آپ Oil based فاؤنڈیشن اگر جلد چکنی تو waterbased فاؤنڈیشن استعمال کریں۔ ہمیشہ اپنی جلد کی قدرتی رنگت سے قریب تر شیڈ کا انتخاب کریں۔ عموماً خواتین اپنے ہاتھ پر فاؤنڈیشن لگا کر شیڈ کا انتخاب کرتی ہیں، یہ طریقہ غلط ہے آپ ماتھے پر تھوڑا سا فاؤنڈیشن لگائیں اور پھر صحیح شیڈ کا انتخاب کریں۔ چہرے کے ساتھ گردن پر فاؤنڈیشن لگانا نہ بھولیں۔ فاؤنڈیشن کو نقطوں کی شکل میں پورے چہرے اور گردن پر لگائیں، آنکھوں کے نیچے اور رخساروں پر خاص توجہ دیں۔ اس کے بعد جس سمت آپ کے چہرے کے بال ہیں اس سمت فاؤنڈیشن کو پھیلانا شروع کریں۔

تاثرات

محترم ایڈیٹر صاحب، آداب!

خواتین دنیا کا اولین شمارہ نظر سے گزرا، سبحان اللہ۔ یہ اردو صحافت کی تاریخ کا سب سے شاندار، بامقصد اور معیاری جریدہ ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے نصف اردو داں آبادی کی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ مبارک باد قبول فرمایئے۔ دعا گو

فاروق ارگلی، دہلی

مکرمی! 'خواتین دنیا' کا پہلا شمارہ ملا۔ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ بہترین کاغذ، شاندار طباعت، رنگین و خوش رنگ تزئین کاری، دل کو موہ لینے والے مضامین۔ روح کی گہرائیوں تک اتر جانے والی کہانیاں اور شاعری۔ غرض ہر پہلو سے قابل تعریف، ہر اعتبار سے معیاری ہے اور ہر زاویے سے صحافتی اقدار کا آئینہ ہے۔ اس کے مشمولات دیکھ کر ہی قاری متاثر ہو جاتا ہے۔ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کو مبارک باد پیش کرتی ہوں کہ انھوں نے اپنی اعلیٰ ذہانتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے خواتین کے جذبات و احساسات کی شدت کو محسوس کیا اور عالمی معیار کا عظیم ترین ماہنامہ جاری کرکے آدھی آبادی کو شکر گزاری کا موقع عنایت فرمایا۔

خواتین دنیا ہر طرح سے بلند فکری کا مظہر ہے لیکن اس میں کچھ کمیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اولاً یہ کہ اس کے ادارتی عملے میں ایک بھی خاتون نہیں ہے۔ دوم سماجی و اصلاحی مضامین کی قلت نظر آتی ہے۔ سوم ادب کو زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ گزارش ہے کہ ادب اور سماج کو متوازن کیا جائے۔ ایسی شخصیات پہ زیادہ زور دیا جائے جنھوں نے اپنی محنت اور لگن کے سبب کامیابی حاصل کی۔ ان لڑکیوں کے انٹرویو شائع کیے جائیں جن کو آگے بڑھنے اور کچھ کر دکھانے کا شوق ہے لیکن مرد ساز سماج کی ہوسناک جہالت کے سبب ان کی خواہشات دم توڑ دیتی ہیں۔ کام کاجی خواتین جو ہر روز ایک زندگی جیتی اور مرتی ہیں، پر بھی سلسلے وار مضامین شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

امید ہے کہ آئندہ اشاعتوں میں اسے مزید وقیع بنایا جائے گا۔ ایک بار پھر مبارک باد۔

شمیم الفت، گری ڈیہہ، جھارکھنڈ

مکرمی! فی زمانہ اردو میں شائع ہونے والے اخبارات کی ہی تعداد سمٹ رہی ہے، رسائل تو صرف یادِ ماضی بنتے جا رہے ہیں۔ جو رسالے نظر آ رہے ہیں وہ یا تو بہت سخت جاں لوگوں کی صبر آزما کوششوں کے سبب یا پھر سرکاری امداد و اعانت کی وجہ سے۔ ان میں بھی بڑی تعداد ایسی ہے جن میں صرف مرد قلم کاروں کی کثرت ہوتی ہے۔ خواتین قلم کاروں کو تو محض وزن پورا کرنے یا زحاف و زوائد تک ہی محدود رکھا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی طرف سے صرف خواتین قلم کاروں کی نگارشات کی اشاعت اور اس آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لیے "خواتین دنیا" جاری کرنا ایک انتہائی خوش آئند قدم ہے۔

خواتین دنیا کا پہلا شمارہ کئی اعتبار سے قابل تعریف ہے۔ خواتین میں قانونی حقوق کے تئیں بیداری پیدا کرنا خواجہ عبدالمنتقم کا سلسلہ "آئین میں عورت" کارآمد اور فائدہ مند ہے۔ پورے ماہنامے میں صرف خواجہ صاحب ہی ایک مرد قلم کار ہیں باقی ان کے علاوہ احمد ندیم قاسمی کا قرۃ العین حیدر سے مکالمہ بھی بہت عمدہ اور یادگاری ہے مذکورہ کے علاوہ تمام مضامین خواتین کے لکھے ہوئے ہیں۔

انوشہ انصاری پر سعدیہ اقبال کا مضمون کافی معلوماتی ہے۔ اگر اس میں مزید تفصیل ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔ اسی طرز پر اپنی محنت لگن شوق سے آگے بڑھتی لڑکیوں پر زیادہ سے زیادہ مضامین اور ان کے فوٹو شامل کیے جائیں تو اچھا رہے گا۔ کئی کہانیاں دل کو چھو لیتی ہیں۔ مجھے ترنم ریاض اور سلمیٰ صنم کی کہانیوں نے بہت متاثر کیا ہے۔ خواتین کی دیگر دلچسپیوں پر مزید مضامین شامل کیے جائیں جن میں خواتین کو درپیش مستقل امراض اور ان کے تدارک نیز ہنرمندی سے متعلق جیسے کمپیوٹر کشیدہ کاری وغیرہ پر بھی مضامین لکھے جائیں۔ امید ہے کہ آئندہ اشاعتوں میں اس کے معیار کو بلند کرنے والے مضامین شامل ہوں گے۔ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر

ارتضیٰ کریم اور ادارتی بورڈ کے تمام رفقا کو دل سے مبارکباد کہ انھوں نے بھارت کے وزیر اعظم جناب نریندر مودی کے خواب ''خواتین کی مختاریت'' اور سب کا ساتھ سب کا وکاس، کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش میں ایک قدم تو بڑھایا۔

انیسہ رئیس اعظم خاں، ابوالفضل انکلیو۔ اوکھلا، نئی دہلی

محترم سلام ومسنون! امید ہے مزاج اچھا ہوگا۔

خواتین دنیا کا پہلا شمارہ باصرہ نواز ہوا اور قارئین کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ اس رسالے کی اشاعت پر دلی مبارک باد قبول کریں۔ پہلے شمارے کے مشمولات یقیناً اہمیت کے حامل ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ بہت جلد اپنی شناخت بنالے گا۔ اس رسالے کو آپ نے عالمی یوم خواتین کے موقع پر شائع کرکے عورتوں کے تئیں اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ اس رسالہ کے ذریعہ ان خواتین کی علمی، ادبی، سیاسی، ثقافتی، سائنسی اور دیگر خدمات سے قارئین روشناس ہوں گے جو کسی وجہ سے پردہ، گمنامی میں تھیں۔ پیش نظر شمارے میں سعدیہ اقبال کا مضمون ''خلائی اسٹیشن تک پہنچنے والی پہلی مسلمان 'انوشہ انصاری' بہت پسند آیا۔ یہ مضمون اردو داں خواتین میں بااختیار بننے کے عمل میں تحرک پیدا کرے گا۔ دوسرا مضمون ''عورت کمزور نہیں'' دراصل ہماری کامیاب اور ترقی یافتہ خواتین کی داستان ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو داں خواتین نے بھی زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیابی کے پرچم کو بلند کیا ہے۔ ترنم ریاض کی کہانی میں عورتوں کی ذہنی کشمکش اور معاشرتی اصلاح کا پہلو شامل ہے۔ آج کے معاشرے میں ایسی کہانیوں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مشمولات بھی اچھی اور معلوماتی ہیں۔ اس رسالے کا نام اگر خواتین کی دنیا ہوتو زیادہ بہتر ہوتا۔

دعا ہے کہ یہ رسالہ بہت جلد مقبول عام ہو اور خواتین کے بہبود میں نمایاں کردار ادا کرے۔

ڈاکٹر فرزانہ خلیل، سابق صدر شعبہ اردو آر بی ڈی کالج بجنور یوپی

مکرمی۔ ایڈیٹر صاحب! ماہنامہ خواتین دنیا کی اشاعت کے لیے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ میری معلومات کی حد تک کسی بھی سرکاری ادارے سے صرف خواتین کا کوئی رسالہ نہیں نکلتا صرف قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہی شاید ایسا واحد ادارہ ہے جس نے اس سمت عملی اقدام کرکے اردو دنیا کی آدھی آبادی کو ممنون کیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان تقریباً بیس پچیس برسوں سے سرگرم عمل ہے۔ گوکہ اس سے قبل یہ بیورو تھا۔ کونسل نے اپنے ابتدائی زمانے میں ''اردو دنیا''، ''بچوں کی دنیا'' اور تحقیقی سہ ماہی فکر و تحقیق شروع کردیے تھے لیکن ملک کی آدھی آبادی کے دیرینہ مطالبے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ بھارتی جنتا پارٹی کے عہد حکومت میں پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب کی فعالیت اور جرأت مندی نے یہ چونکا دینے والا قدم اٹھایا ہے اس کے لیے مرکزی حکومت اور کونسل کے ڈائرکٹر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

یہ ماہنامہ کئی اعتبار سے لائق تحسین و آفرین ہے۔ ایسے دور میں جبکہ اردو کے مشہور و معروف رسائل بھی مارکیٹ سے اچاٹ ہوگئے ہیں اور جو نظر آرہے ہیں ان کی سانسیں اکھڑی ہوئی ہیں۔ ایسے حالات میں کونسل نے مکمل رنگین رسالہ جاری کرنے کی ہمت دکھائی یہ واقعی حیران کن ہے۔ رسالے میں ایک آدھ کو چھوڑ کر تمام مضامین خواتین پر اور خواتین کے ہیں، یہ بھی ایک نئی بات ہے اس کے مستقل عنوانات بھی قاری کے ذہن پر سحر کرنے والے ہیں جیسے پرواز کے نئے آسمان، صحت سخن، جہان نسواں وغیرہ۔ ایک خاص اور انوکھی بات یہ ہے کہ ماہنامے میں متفرق و منتخب اشعار بھی صرف شاعرات کے ہی شائع ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ''خواتین دنیا'' اپنی نوعیت کا منفرد ماہنامہ ہے اس کی قیمت بھی بہت کم ہے صرف دس روپے میں یہ رسالہ بہت ارزاں ہے۔ میری طرف سے دل کی گہرائیوں سے ایک بار پھر مبارکباد۔

اسما یاسمین، بنگلور، کرناٹک

جناب ایڈیٹر صاحب! ''عالمی یوم خواتین'' کے موقع پر قومی اردو کونسل کی طرف سے ''ماہنامہ خواتین دنیا'' کی اشاعت خواتین کے لیے بیش قیمتی تحفہ ہے۔ سرکاری ادارے سے شائع ہونے والا اپنی نوعیت کا پہلا اردو رسالہ ہے جس میں شامل بھی نگارشات صرف خواتین کی ہیں نیز خواتین سے متعلق ہیں۔

متن کے اعتبار سے ''پرواز کے نئے آسمان'' اور خواتین کے تحفظ کے لیے قانونی معلومات کا سلسلہ بہت ہی مفید معلوماتی نیز موجودہ ماحول میں خواتین میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی ایک اچھی کوشش ہے۔ انشائیہ، افسانے، غزل و نظم، صحت سخن، موسم کے اعتبار سے لذیذ پکوان، مشروبات آرائش و زیبائش کے آسان اور بے ضرر طریقے بھی بہتر ہے۔ امید ہے نئی نسل کے لکھنے والوں کو موقع دیا جائے گا اور آئندہ شماروں میں کہانیوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے تو اچھا رہے گا۔

کم قیمت میں اس قدر معیاری، دلکش، دیدہ زیب ''خواتین دنیا'' کی اشاعت کے لیے آپ کو بہت بہت مبارک باد۔

حنا کوثر، جگدیش پور، سلطانپور، یوپی

خواتین کو اپنے حقوق کی جنگ خود لڑنی ہوگی

نئی دہلی (پریس ریلیز)۔ شمالی مشرقی دہلی، نہرو یووا کیندر کی طرف سے عالمی یوم خواتین کے موقع پر انوپ وانیکا موجپور میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر شاہدرہ کے ضلع مجسٹریٹ وشوموہن نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس پروگرام کا اہتمام سماجی تنظیم نیو مون اور نہرو یووا کیندر نے کیا تھا۔ اس موقع پر وشوموہن نے کہا کہ آج

خواتین کو خودکفیل اور خود مختار بننے اور بے خوف ہوکر اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے پرعزم ہونے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر نیو مون سے ووکیشنل کورس مکمل کرنے والی تقریباً 200 لڑکیوں کو سرٹیفکیٹ بھی تقسیم کیے گئے۔ آخر میں اس پروگرام کے کنوینر و نیو مون تنظیم کے جنرل سکریٹری محمد شمیم ملک نے بچوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ بچیاں ہی کل کے ہندوستان کا مستقبل ہیں اور انھیں نہ صرف اچھی تعلیم کی ضرورت ہے بلکہ اچھے ہنر اور تربیت سے بھی آراستہ کرنا ہماری ذمہ داری ہے، جو لڑکی اچھی تعلیم و تربیت حاصل کرے گی وہی آگے چل کر اچھی بیوی اور اچھی ماں بنے گی اور سماج میں پھیلے اندھیرے کو اپنی تعلیم و تربیت سے روشنی میں تبدیل کرنے میں اہم رول ادا کرے گی۔ اس موقع پر نہرو یووا کیندر کے ڈی وائی سی موہن سنگھ شاہی و دیگر حضرات بھی موجود تھے۔

سماج میں خواتین کو اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی فکر ہونی چاہیے

خواتین کو اپنے مسائل کے حل کے لیے سماج میں ہی کام کرنے کی ضرورت ہے، یوم خواتین پر تعلیمی اداروں سے وابستہ خواتین کا اظہار خیال

سنبھل (سعد نعمانی) ہر سال یوم خواتین کے موقع پر ملک بھر میں مختلف تقریبات کا انعقاد کیا جاتا رہا ہے جس میں خواتین کے مسائل پر غور وخوض کیا جاتا ہے۔ سنبھل کے تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والی کچھ خواتین نے نمائندے سے اس موقع پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

کشور جہاں زیدی

معروف ادیبہ اور آزاد گرلس کالج کی شعبہ اردو کی سابق پروفیسر ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کا کہنا تھا کہ سماج میں خواتین کے مسائل کا ایک انبار ہے، کچھ مسائل کا تعلق ان کی اپنی ذاتی زندگی سے ہے، کچھ کا تعلق سماجی سطح پر ہے اور کچھ کا اپنی کوتاہی سے ہے، ان مسائل کو خواتین کی طرف سے ہمیشہ اٹھایا جاتا رہا ہے، مگر مسائل میں روز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے کہا کہ خواتین کی اکثریت میں خود اعتمادی کی کمی، تعلیم کا فقدان اور احساس کمتری میں مبتلا ہونا ہے۔ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کا کہنا تھا کہ اگر خواتین میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے اور وہ تعلیم کے تئیں بیدار ہوں تو ہر محاذ پر سربلند ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اگر یوروپی خواتین کی ترقی کو ان کی بے حیائی سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے تو یہ غلط فہمی ہوگی، کیونکہ باپردہ خواتین بھی دنیا میں میں وہ مقام حاصل کر رہی ہیں جہاں آج تک مغربی خواتین نہیں پہنچی ہیں۔ انھوں نے کہا مثال کے طور پر ایران اور ترکی کے معاشرہ پر نگاہ ڈالی جا سکتی ہے۔

معروف ادیبہ شمیم فاطمہ ایڈوکیٹ نے یوم خواتین پر ہندوستان سمیت دنیا بھر کی خواتین کو مبارک باد دی کہ آج کے دن دنیا میں خواتین اپنا

شمیم فاطمہ

محاسبہ کرتی ہیں، اپنے مطالبات کو حکومت کے سامنے لاتی ہیں اور اسی دن کی نسبت سے ملک بھر میں تقریبات کا انعقاد کیا جاتا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ خواتین کی ترقی میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہر محاذ پر خواتین کسی کسی نہ طرح نظر آرہی ہیں۔ شمیم فاطمہ کا خیال تھا کہ جس طرح معاشرے میں خواتین کی پذیرائی کی ضرورت ہے وہ ابھی دکھائی نہیں دیتی ہمارا معاشرہ خواتین کے تئیں آج بھی اپنی سوچ اور فکر کو بدل نہیں پارہا ہے یعنی خواتین کی تعلیم کی طرف جو توجہ دی جانا چاہیے اس میں اب بھی لاپرواہی ہو رہی ہے اگرچہ کہ پہلے سے کچھ حالات نے کروٹ لی ہے مگر مزید انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور یہ کام کسی حکومت کو نہیں ہمارے سماج کو کرنا ہوگا۔

سنبھل ایم جی ایم کالج کی شعبہ اردو سے وابستہ ڈاکٹر ہما فاطمہ کا خیال تھا کہ خواتین کو اپنے مسائل کے حل کے لیے سماج میں ہی کام کرنے کی ضرورت ہے چونکہ ہمارے سماج میں آج بھی خاتون کو وہ مقام میسر نہیں جس کی ضرورت ہر میدان میں ہے۔ ہما فاطمہ نے کہا اگر سماج میں خواتین کے تئیں بیداری پیدا ہو جائے تو تمام مسائل کا حل آسانی سے ممکن ہے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب خواتین خود کوشش کریں اور اپنے مسئلہ کو سنجیدگی کے ساتھ سماجی حلقوں میں رکھیں۔

ہما فاطمہ

فیض گرلس کالج سرائے ترین کی پرنسپل جہاں آرا تبسم کا کہنا تھا کہ خواتین کو اپنے مسائل کے لیے ہر میدان میں آنے کی ضرورت ہے اگرچہ آج بھی ایسا ہو رہا ہے لیکن جس طرح خواتین کو اس کے لیے سنجیدہ ہونا چاہیے ابھی وہ مزاج نہیں بن پارہا ہے انھوں نے خواتین کی روز مرہ کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ محنت لگن اور خلوص کی پیکر ایک خاتون اس دور میں بھی اپنی ذاتی زندگی سے بے پناہ پریشان و حیران نظر آتی ہے جس کے لیے سماجی تفریق ذمہ دار ہے ہمیں سماجی طور پر تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔

جہاں آرا تبسم

خواتین کے بین الاقوامی دن پر کئی شہروں میں ریلیاں

واشنگٹن، 9 مارچ (اے یو ایس) بین الاقوامی یوم خواتین کی مناسبت سے بدھ کے روز امریکہ کے مختلف شہروں میں ہزاروں خواتین نے ریلیوں میں حصہ لیا، جس کا مقصد معیشت میں خواتین کی اہمیت کو اجاگر کرنا تھا۔ منتظمین نے دن کا عنوان 'خاتون کے بغیر دن' رکھا تھا، جس کا مقصد خواتین کی معاشی طاقت کا اظہار تھا انھیں کہا گیا تھا کہ وہ آج کام نہ کریں اور پیسے خرچ کرنے سے احتراز کریں، ماسوائے چھوٹے کاروبار چلانے والی خواتین اور اقلیت کی ملکیت والے کاروباری ادارے چلانے کے۔ دن منانے والوں نے مظاہروں میں شریک خواتین سے بازو پر سرخ پٹی باندھنے کی ہدایت کی تھی۔ جس گروپ نے 21 جنوری کو واشنگٹن ڈی سی میں خواتین مارچ کا انعقاد کیا تھا، انھوں نے خواتین سے کہا تھا کہ ایک دن خواتین کے لیے وقف کریں۔ بدھ کے روز کی ریلیاں اسی اقدام کا تسلسل تھیں، جب لاکھوں خواتین واشنگٹن ڈی سی سمیت ملک کے مختلف شہروں میں احتجاج کے لیے

نکل آئی تھیں، جس سے ایک ہی روز قبل صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے عہدے کا حلف لیا تھا۔ 'خاتون کے بغیر ایک دن' ان سینکڑوں ریلیوں کا ایک حصہ تھا جو بدھ کو ملک کے مختلف حصوں میں نکالی گئیں۔ واشنگٹن ڈی سی میں، احتجاج کرنے والی خواتین وائٹ ہاؤس کے سامنے جمع ہوئیں، جہاں شرکا نے عشروں سے جاری پالیسیوں کے خلاف نعرے بلند کیے، جن میں سے صدر ٹرمپ کی پالیسی بھی شامل ہے، جس کے تحت اسقاط حمل کے لیے امریکہ کی جانب سے دی جانے والی بیرونی امداد بند کر دی گئی ہے۔ ایوان نمائندگان کی عمارت کے باہر، کانگریس کے ارکان جمع تھے جس اجتماع کی قیادت، اقلیتی لیڈر نینسی پلیوسی کر رہی تھیں۔ ریلی میں 100 سے زائد مظاہرین بھی موجود تھے۔ پیلوسی نے کہا کہ اگر "میں دنیا کی حکمران ہوتی، تو میری یہ کوشش ہوتی کہ دنیا کی تمام بچیوں کو تعلیم کی سہولت میسر ہو۔" ایوان نمائندگان کی کئی دیگر خواتین ارکان نے بھی اس موقعے پر خطاب کیا جس میں ٹرمپ انتظامیہ کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کی گئی۔ ایوان کی رکن، نانیتی براگن نے کہا کہ "تارکین وطن کے حقوق، دراصل خواتین کے حقوق ہیں"۔ نیو یارک سٹی میں، خواتین مارچ کے منتظمین نے ایک بڑی ریلی نکالی، جو شہر میں خواتین حقوق تحریک کی تاریخی عمارات کے سامنے سے گزری، جس موقعے پر خواتین کے حق میں نعرے بلند کیے گئے ہیں۔ اپنے ایک ٹوئٹر پیغام میں، صدر ٹرمپ نے اقوام متحدہ کے تسلیم کردہ خواتین کے بین الاقوامی دن منائے جانے کی حمایت میں آواز بلند کی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو فکشن کی تنقید
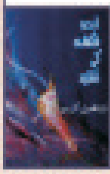
مصنف: ارتضیٰ کریم
صفحات: 546
قیمت: -/230 روپے

تاریخ ادب اردو (1858 تا 1911) جلد: شانزدہم
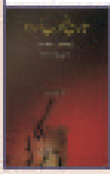
مصنف: محمد انصار اللہ
صفحات: 626
قیمت: 265 روپے

تاریخ ادب اردو (1858 تا 1911) جلد: ہفت دہم
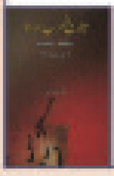
مصنف: محمد انصار اللہ
صفحات: 556
قیمت: 235 روپے

مضامین چکبست

ترتیب و تالیف: آفتاب عالم آفاقی
صفحات: 393
قیمت: -/175 روپے

منٹو کے نادر خطوط
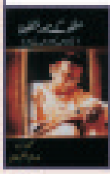
تحقیق و ترتیب: فاروق اعظم قاسمی
صفحات: 62
قیمت: -/55 روپے

زمین
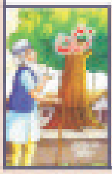
مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

کلیات مضامین وحید اختر (جلد چہارم)
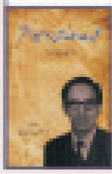
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 305
قیمت: 160 روپے

کلیات مضامین وحید اختر (جلد پنجم)
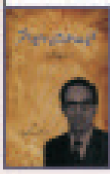
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 204
قیمت: 115 روپے

کلیات مضامین وحید اختر (جلد ششم)
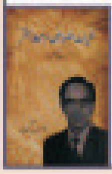
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 216
قیمت: -/115 روپے

آئینۂ جہاں، کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم: رپورتاژ)
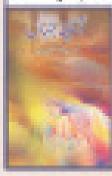
تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182 روپے

آئینۂ جہاں، کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم: مضامین)
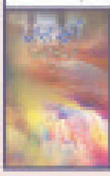
تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 359
قیمت: 165 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)
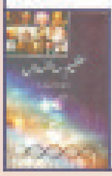
مصنف: اظہار حسین
صفحات: 121
قیمت: -/32 روپے

اسرار کشف صوفیہ (1068ھ مطابق 1658)
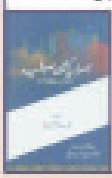
مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین و تصحیح متن و ترجمہ
و حواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 803، قیمت: -/335 روپے

انتخاب سخن (جلد اول) سلسلۂ شاہ حاتم

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: -/175 روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر
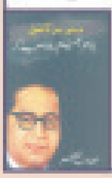
مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70 روپے

داستان گو آیا ہے
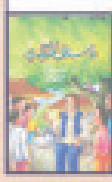
مصنف: رتن سنگھ، مصور: فجر الدین
صفحات: 16
قیمت: 25 روپے

ہماری نظم

مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجر الدین
صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

دوسرا آدمی
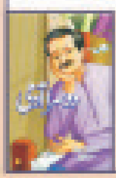
مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746-011، فیکس: 26108159-011، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, June 2017, Vol. 01, Issue: 1 **RNI. REF. No. 1310440**
National Council for Promotion of Urdu Language **Title Code-DELURD 03206**
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

نقارۂ خلق

☆ خواتین دنیا کا پابندی سے مطالعہ کیجئے۔ اس کے تاحیات ممبر بنیں اور بنائیں۔ عربی مدارس، اردو مدارس، کالجز کی لائبریریوں کو اور اپنے دوستوں کو تحفہ پیش کیجئے۔ اس میگزین کو زیادہ لوگوں تک پہنچائیں تاکہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی سرگرمیاں اور فروغ اردو کے نئے امکانات تمام تر معیار کے ساتھ لاکھوں تک پہنچتے رہیں اور دامن اردو کو وسیع کرنے کے لیے خود کا احتساب کریں۔ خواتین کے لیے اردو میں سرکاری سطح پر شائع کیا جانے والا یہ واحد رسالہ ہے جس کا اردو دنیا خیر مقدم کرتی ہے۔ جس میں خواتین کے مسائل کے حوالے سے خیال افروز اور فکر انگیز تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ خواتین کے مزاج اور ذوق کے مطابق نگارشات کا انتخاب کیا گیا ہے۔

☆ کیا آپ نہیں چاہتے ہیں کہ اردو زبان کو پھیلائیں اور اردو زبان کی ترقی ہو؟ سماج اور قوم کی ہمت اور پوزیشن مزید مضبوط ہو۔ تو آیئے آپ بھی ''خواتین دنیا'' کے ساتھ جڑ جایئے، کیونکہ اس ذریعے ان تمام مقاصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح تعلیم اور صحت کو بہتر بنانے میں مدد ہوگی۔ زندگی پر سب کا حق ہے ہم تسلیم کریں گے، خواتین دنیا ہم سب میں برابر تقسیم کریں گے۔ فی الحال ہم بچوں کی دنیا 50 کاپیاں اردو دنیا 20 کاپیاں، خواتین کی دنیا 25 کاپیاں، لوک راجیہ 50 کاپیاں خرید کر بطور تحفہ طلبہ و والدین میں تقسیم کررہے ہیں۔

حال دل کب ادا ہوا پورا کچھ کہا بھی ہے، کچھ رہا بھی ہے

کتب و رسائل بے حد اچھے مقاصد کے پیش نظر جاری کیے جاتے ہیں لیکن اس میدان میں ارادہ و شوق عمل ضروری ہے۔ جب تک انسان خود ارادہ نہ باندھے اس وقت تک سفر مکمل نہیں ہوتا۔ خواتین اس میدان میں جب اتریں گی یعنی شوق مطالعہ کو اہمیت دیں گی۔ مشاہدات کو سمجھیں گی۔ خاص کر اس مقصد کے ساتھ کہ اس سے ان کو وہ چیز اخذ کرنی ہے جو ذہن کو کشادہ کرنے والی اور دل کو بھی اس کے مطابق کرنے والی ہو تو ان کا سفر اس سمت میں کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔

اٹھاتی ہے جو خطرہ ہر قدم پر ڈوب جانے کا وہی کوشش سمندر میں خزانے ڈھونڈ لاتی ہے

ٹیم اردو نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول پمپری پونے 018 411، Cell: 9518352212

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025